انگریزی

نظامِ تعلیم کا اساسی تخیل

[لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت
کا ترجمہ اور اس پر تبصرہ]

عبدالحمید صدیقی

روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، بی، ون ایریا، 11/6
لیاقت آباد، کراچی ۱۹

نمبر شمار		صفحہ
۱۔	پیش لفظ	۵
۲۔	مقدمہ	۷
۳۔	لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت کا ترجمہ	۳۹

حال

بار اوّل — ایک ہزار

سال طباعت — مارچ ۱۹۶۵ء

قیمت — ایک روپیہ

مطبوعہ۔ — ایجوکیشنل پریس کراچی

ملنے کے پتے:۔

انڈیا میں۔

(۱) مکتبہ تجلّی، دیوبند یو، پی

(۲) کتب خانہ انجمن ترقی اُردو جامع مسجد دہلی ۶۔

پیش لفظ

آئندہ اوراق میں ہم مشہور قانون دان اور ماہر تعلیم لارڈ میکالے کی اس تاریخی یادداشت کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو انہوں نے برِ عظیم پاک و ہند میں نظام تعلیم کی تبدیلی کے لیے ۱۸۳۵ء میں اس وقت کے گورنر جنرل کے سامنے پیش کی تھی

جب کہ مسئلہ تعلیم ہمارے ملک کے تمام سوچنے والے افراد کی توجّہ کا مرکز بنا ہوا ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان عزائم اور مقاصد کو اچھی طرح سمجھ لیں جنہیں سامنے رکھ کر انگریزی سامراج نے ہمارے لئے وہ نظام تعلیم تجویز کیا تھا جس کو ہم آج بھی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

ترجمہ میں اس بات کا پُورا پُورا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ اُس یادداشت کی آزاد ترجمانی نہ ہو بلکہ اُس کے انگریزی متن کو لفظ بلفظ اُردو میں ڈھال دیا جائے۔

آغاز میں اس نظام تعلیم کے متعلق چند گذارشات بھی پیش کر دی گئی ہیں ترجمے اور تبصرے میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑی دلچسپی کا اظہار فرمایا تھا اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا تھا۔ اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر دے۔

اس سلسلہ میں پروفیسر حمید احمد خان صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اس کام کی مجھے ترغیب دی بلکہ اس میں رہنمائی بھی فرمائی۔ خداوند تعالےٰ انہیں بھی اسکا اجر عطا فرمائے۔

خاکسار
عبد الحمید صدّیقی

لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

مقدمہ

وہ محکم چٹان جس کی بنا پر ایک قوم اپنی ہستی کو دُنیا میں قائم رکھ سکتی ہے اور دُنیا کی ہر اُس رَو کو جو اُسے اپنے ساتھ بہالے جانے کے لئے آگے بڑھے، ناکام و نامراد بنا دیتی ہے، اُس قوم کی قوّتِ ایمانی ہے جس قدر یہ قوت زیادہ ہوگی، اُسی قدر اُس قوم کے اندر ہر سیلاب کے مقابلہ کرنے کی استعداد بھی زیادہ ہوگی۔ دُنیا میں آج تک کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی ایمان کی حرارت سے خالی ہو۔ تاریخ پر ایک عمومی نگاہ ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ قوموں کی بقا اور ترقی میں اس قوّت نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کسی قوم کی زندگی اس کی قوت ایمانی سے وابستہ ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ قوّت نہ صرف ایک فرد کے اندر سعی و جہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے بلکہ اُس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انہیں ایک راہ پر لگاتی ہے۔ پھر اُسی کی مدد سے افراد کے مابین مودّت اور اخوّت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور اس طرح معاشرتی زندگی کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اسی سے اجتماعی شعور کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے اور مختلف قومیں اور ملتیں جنم لیتی ہیں۔ اسی کی بدولت افراد اور اقوام میں عمل کی خواہش اور ترقی کی تڑپ پرورش پاتی ہے۔ یہ اسی قوت کا اعجاز ہے کہ لوگ ذاتی اغراض و منافع

کی پرستش سے بلند ہو کر اجتماعی مفادات کی خاطر زندہ رہنا سیکھتے ہیں۔ جب یہ قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر قومیں صفحہ ہستی سے خود بخود مٹ جاتی ہیں اور کوئی خارجی سہارا انہیں زندگی عطا نہیں کر سکتا۔

یہ قوت چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے۔ اس لئے دنیا کی کسی غاصب قوم نے جب بھی اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے ایک کمزور قوم پر دستِ ظلم دراز کیا تو اُس نے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اس امر کی کوشش کی کہ کسی طرح مفتوح قوم کے فکر و نگاہ کو بدل دیا جائے کیونکہ اس کے تبدیل ہو جانے سے پھر اُس کا مقصد بآسانی حل ہو سکتا ہے: "تیر و سنان" افراد کو موت کے گھاٹ تو اتار سکتے ہیں مگر قوموں کو فنا نہیں کر سکتے۔ قوموں کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں اس گنج گرانمایہ سے محروم کر دیا جائے جس کے بل بوتے پر اُن کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے اور جس کے لٹ جانے کے ساتھ ہی وہ قومیں، قومیں نہیں رہتیں۔ بلکہ بے ضمیر انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ بن جاتی ہیں جنہیں استعمار کی قوت جس طرف چاہتی ہے بے زبان جانوروں کی طرح بالکل میکانکی طور پر ہانک لے جاتی ہے۔

پھر اُمتِ مسلمہ کے حق میں اس "کیمیا" کو تو خاص طور پر آزمایا گیا ہے۔ وہ لوگ جو اس قوم کے مزاج سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کی تشکیل و ترتیب میں خاک و خون کے مادی رشتوں اور خاندانی، قبائلی اور گروہی تعصبات اور نسلی یا ملکی مفادات کا قطعی کوئی دخل نہیں۔ اس کی قومیت کی اساس محض ایک تنزیہی تصور ہے جس کا تحقق ملتِ بیضا کی صورت میں

ہوتا ہے۔ اس بنا پر ایک تصوّر ہی یہاں ایک قوم کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اِسی سے زندگی کے مختلف چشمے پھوٹتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک ایمان کی حیثیت محض ایک مجموعۂ افکار کی نہیں بلکہ یہ اِس قوم کا مبدا، اور اساس ہے۔ مسلمان جب تک مسلمان ہیں کبھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ وُہ مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دُوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کریں یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو اُن کے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔ اگر دُنیا کی کوئی قوم قوّت و طاقت کے بل بوتے پر یا چالبازی اور عیاری کے سحر سے اِس ملّت کو دین سے برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اُس نے بازی جیت لی۔ کیونکہ دین کے رُخصت ہو جانے کے بعد اس کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ دُنیا کی جن قوموں نے مُسلمانوں کو زیر کرنا چاہا، وُہ مدّت بھر کے تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اُن کے ہاتھوں سے تیغ و سناں کا چھین لینا اس قدر ضروری نہیں جس قدر کہ اُن کے دِل و دماغ میں متاعِ ایمان کی قیمت و اہمیت کو کم کر دینا ہے۔ دیگر ممالک اسلامیہ کا ذکر چھڑ گیا تو یہ داستان بڑی طویل ہو جائے گی۔ اِس لئے سرِدست ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ اس برِعظیر کے مُسلمانوں کی متاعِ ایمان کو ایک جنسِ کاسد ٹھہرانے کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں۔

غیر ملکی سامراج نے اس مقصد کے حصُول کے لئے جو ضابطہ طے کیا اس کی پہلی شق یہ ہے کہ اس قوم کو معاشی حیثیت سے اتنا پامال کیا جائے کہ وُہ اپنی قیمتی متاع بھی منڈی میں بیچنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ پھر اُسے روٹی کا لالچ

دے کر کہا جائے کہ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس گراں بہا شئے کا بھی سودا کرو۔
ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں ان حربوں کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو مسلمان کو مفلس اور قلاش بنانے کے لئے استعمال کئے گئے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اگرچہ اُس کے جواز میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرزِ عمل سے بنگال کے مسلمان گھرانے بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ ہم نے مسلمان اُمرا کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت اُن کو بے دخل کر دینے ہی میں ہے۔ ہم نے انہیں دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اسی لئے خارج کر دیا کیونکہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے از حد ضروری تھا مگر یہ دلائل کتنے ہی وزنی کیوں نہ ہوں اُن پرانے نوابوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جو برطانوی حکومت کی بے راہ روی کی وجہ سے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ فوج سے بیدخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی بے انصافی ہے اور اُن کے پرانے نظامِ مالیات سے ہمارا انحراف صریحاً وعدہ خلافی ہے۔"[۱۱]

"اُن کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی۔ حالات و واقعات پر زور دینا نا واجب ہے۔ لیکن پھر بھی سوچنا چاہیئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل

ہوتے یا ہائیکورٹ کے جج بنتے ہیں اُن میں ایک بھی مُسلمان نہیں۔
حالانکہ جب یہ مُلک ہمارے قبضہ میں آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد تک
بھی حکوُمت کے تمام کام مُسلمانوں ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتے تھے،
جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ مُسلمان کلکٹر ہی مالگزاری جمع کرتے تھے۔
مُسلمان فوجدار اور کوتوال ہی پولیس کے افسر تھے۔"

"تمام نظامِ حکوُمت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی
پہلے حکوُمت کی اجارہ دار تھی کم ہوتے ہوتے ایک اور تیس رہ گیا ہے
اور وُہ بھی ان گزیٹڈ ملازمتوں میں ہے جہاں تناسب کا خاص طور پر
خیال رکھا جاتا ہے۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمُولی ملازمتوں میں
مُسلمانوں کا حصہ قریب قریب معدوم ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں،
ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا
نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے۔ دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں
مُسلمان قلی، چپراسی، یا دفتری یا قلم بنانے والے کی آسامی سے اُوپر
کسی اسامی کا متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔"

یہ ہیں وہ حربے جن کی مدد سے اسی ڈاکٹر کے الفاظ میں "بتدریج اسلامی
ہندوستان دارالحرب بنا دیا گیا! در ایک عظیم الشان روایات کی حامل قوم دُنیا میں
یُوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی" سلطنت چھن گئی۔ جماعت کا نظام درہم
برہم ہو گیا۔ اسلامی قوانین معطل ہوئے۔ اسلامی تہذیب کو سہارا دینے والی تعلیم بھی
باقی نہ رہی۔ ساری قوم جہالت کا شکار ہوئی۔ اس پر مزید اس کو پیٹ کی مار

دی گئی، معیشت کے دروازے اس پر ایک ایک کر کے بند کئے گئے۔ اس کو اُن لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار کیا گیا جو کل تک خود اس کے محکوم تھے اور اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلاشوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کے ایمان کی قیمت گرنا شروع ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ مارکیٹ میں ایک جنسِ فروختنی کی حیثیت سے آگیا۔

مُسلمان کے ساتھ یہ سلوک کچھ اس وجہ سے نہ تھا کہ ہندوؤں یا انگریزوں کے مقابلے میں اُن کی ذہنی استعداد کم تھی اور اُن میں امورِ مملکت چلانے کی صلاحیت نہ تھی۔ مُسلمانوں کی ذہانت اور فطانت کا خود حاکم قوم کے سرکردہ لوگوں نے بھی اعتراف کیا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلےٰ قوم تھی۔ اس کے افراد نہ صرف جرأت اور قوتِ بازو رکھتے تھے۔ بلکہ سیاسیات میں بھی سب سے ارفع و اعلےٰ تھے۔ لیکن اس کے باوجود مُسلمانوں پر ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع میں انہیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

"عزم، تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندو اُن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔"

(بغاوتِ ہند اور ہماری آئندہ پالیسی از ہنری ہرنگٹن طامس)

مسلمانوں کو اگر معاشی اعتبار سے تباہ حال کیا گیا تو اس کے پیچھے صرف یہی ایک ناپاک جذبہ کام کر رہا تھا کہ کسی طرح یہ لوگ پیٹ کی خاطر ایمان کو بھینٹ چڑھا دیں ۔ اُمتِ مسلمہ پہلے تو اس پر قطعاً تیار نہ ہوئی اور ایک زبردست کشمکش کے ساتھ اس جنسِ گراں مایہ کی حفاظت اور پاسبانی کی ۔ مگر جب دنیا اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اس پر تنگ ہوگئی اور اس کے افراد کے لئے جسم اور رُوح کے رشتے کا قائم رکھنا ناممکن ہوگیا تو پھر سب سے پہلے اس نے اپنی عزتِ نفس کو حاکم قوم کے قدموں میں لا ڈالا۔ مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کا اندازہ ذیل کی اس عرضداشت سے لگایا جاسکتا ہے جو افلاس سے مارے ہوئے ان مجبور انسانوں نے اڑلیسہ کے کمشنر کے سامنے پیش کی :۔

"ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ ملک کی سرکاری ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے ۔ اگر سچ پوچھئے تو اڑلیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جارہا ہے اور ان کے سربلند ہونے کی کوئی اُمید نہیں ۔ مسلمان اعلےٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا کوئی پرسانِ حال نہیں ۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہو رہی ہے ۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم حضور کی خدمت میں اس یقین کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت کر رہے ہیں کہ حضور ہی اڑلیسہ کے ڈویژن میں ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندے ہیں ۔ ہمیں اُمید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا ۔ اپنی سابقہ ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس

ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دُنیا کے دور دراز گوشوں کا رُخ کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کے لیئے مستعد ہیں۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصّوں میں مارے مارے پھرنے کے لیئے آمادہ ہیں۔ بشرطیکہ ہمیں یقین دلا دیا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں دس ﷲ شلنگ۔ (تقریباً ساڑھے سات روپے) ہفتہ کی ملازمت سے نوازا جائے گا۔"

اِس عرضداشت کو بار بار پڑھیے اور دیکھئے کہ یہ عرضداشت کن لوگوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ وہ جن کے قدموں میں دُنیا نے کبھی اپنے سارے خزانے لاکر ڈال دیئے مگر انہوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھاکر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ جن کا دستِ سوال کبھی بھی کسی انسان کے سامنے دراز نہ ہوا تھا۔ وہ جن کی پیشانیاں مالک الملک کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنے نہ پائی تھیں۔ وہ آج ذلیل و خوار ہوکر ایک ظالم قوم کے حضور میں دادرسی کے لیئے فریاد کر رہے ہیں اور اپنی اُس عزتِ نفس کا سودا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، جو ایمان کا ہی ایک لازمی جزو ہے۔

پیٹ کی مار دے کر ایمان سلب کرنے کے علاوہ انگریزوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان پر براہِ راست ڈاکہ ڈالنے کی بھی بہت سی منظم کوششیں کیں اور اُن میں سب سے کھلی ہوئی کوشش عیسائی مشنریوں کا قیام ہے۔ ابھی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی کہ سیرام پور میں سب سے پہلا مشن ولیم کیرے اور اس کے رفقار کار کی زیر نگرانی قائم ہو گیا اور انہوں نے ۱۷۹۳ء میں یہاں سب سے پہلا کالج قائم کیا۔ اس وقت تک حالات کچھ اس قسم کے

تھے کہ کمپنی اسے قرینِ مصلحت نہ سمجھتی تھی کہ ایسی جماعتوں کو کھلم کھلا اپنی سرپرستی میں لیا جائے جو اہلِ ہند کے جذبات کو مشتعل کرنے کا باعث بنیں۔ لیکن اس وقت بھی سرکارِ انگریزی کے پیشِ نظر یہی مقصد تھا کہ اس ملک کے رہنے والے لوگوں کو مذہب سے بیزار کر دیا جائے۔ چنانچہ آنریبل مسٹر الفنسٹن اور آنریبل الیف وارڈ اپنی اپنی یادداشت میں جس میں انہوں نے حکومت کو اس بات کا مشورہ دیا ہے کہ اسے اس الزام کے رفع کرنے کے لئے کہ حکومت اہلِ ہند کا مذہب تبدیل کرنا چاہتی ہے کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ بھی فرمایا ہے:۔

"میں علانیہ تو نہیں مگر درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارے میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے۔ تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں۔ تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ خواہ تعلیم سے اُن کی آراء میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وُہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم اس سے وہ زیادہ ایماندار اور محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے۔"

اس طرزِ عمل کے پیشِ نظر اگرچہ مسلمانوں کو بالجبر عیسائی بنانے کا تو کوئی پروگرام طے نہ کیا جا سکتا تھا مگر عیسائی مشنریوں کے اندھے جوش نے اُن کے اس کام کو "درپردہ" نہ رہنے دیا اور بلّی جلد ہی تھیلے سے باہر آگئی۔ چارلس گرانٹ نے اپنی کتاب میں جو اشاعت تعلیم کے بارے میں لکھی تھی صاف کہا ہے:۔

"ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لئے

ان کی سوسائٹی نہایت ذلیل و خوار ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں دراصل تمام خرابیوں کی جڑ اُن کے مذہبی مراسم ہیں۔ جن کی روح اُن کے قوانین میں موجود ہے اور اُن کے جھوٹے، ناپاک اور مضحکہ خیز مذہبی اصولوں میں مضمر ہے۔ ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہنچائی جائے جو تاریکی میں ہیں۔ بالخصوص ہمارے بانیٔ مذہب کے خالص اور پاک اصول انہیں بتائے جائیں۔ اس بارہ میں ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہوتے ہیں اسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچائیں۔"

(بحوالہ تاریخ التعلیم مصنّفہ جسٹس محمود)

یہاں تک تو عیسائیت کا پرچار صرف "اصلاح حال" کے لئے تھا کیونکہ حاکم قوم یہ سمجھی تھی کہ فساد کی جڑ اہلِ ہند کے مذہب میں ہے اور جب تک اس جڑ کو کاٹ کر پھینکا نہیں جاتا اُس وقت تک یہ لوگ مہذّب اور متمدّن نہیں بن سکتے۔ لیکن کچھ مدّت کے بعد اس ہمدردی کے جذبہ پر سے بھی پردہ چاک ہُوا اور معلوم ہُوا کہ عیسائیت کی تبلیغ کی غایت انسانی فلاح نہیں بلکہ ایک جارحانہ عزم ہے جسے نہ معلوم انگریزی قوم نے کتنی مدّت سے سینے میں پال رکھا تھا۔ مینگلس نے ۱۸۵۷ء کے آغاز میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا:-

"خداوند تعالےٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرِ نگیں ہے تاکہ عیسےٰ مسیحؑ کی فتح کا جھنڈا ہندوستان

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہراتے۔ ہر شخص کو اپنی تمام
ترقوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں
صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہیئے۔"

(حکومت خود اختیاری)

اس مقصد کی تکمیل کے لئے جگہ جگہ سکول اور کالج کھولے گئے۔ پنجاب اور یو۔پی
میں بیسیوں ایسے مراکز قائم ہو گئے جن سے مشن کے لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی۔
سیرام پور مشن کا پہلا ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" انہیں مقاصد کا آئینہ دار تھا۔
ان عیسائی مشنوں کو "عیسائیت" پھیلانے میں تو کوئی قابل لحاظ کامیابی نہ ہوئی
البتہ انہیں اس باب میں یقینی کامیابی حاصل ہو گئی کہ لوگوں کے سامنے جب مذہب
کا نام لیا جائے تو ذہن ایک ایسے نظریئے کی طرف منتقل ہو جاتے جس میں عقل کا
کوئی دخل نہ ہو وہ سرتاپا توہم پرستی، بے دلیل عقیدت اندھے یقین اور جاہلانہ
تعصبات کا مجموعہ ہو اور عملی زندگی میں انسان کی قطعاً کوئی رہنمائی نہ کر سکے بلکہ اس
کی ترقی کی راہ میں روک کا کام دے اور اس طرح ذہین و فطین لوگوں کی نظر میں
یہ خود بخود ایک اضحوکہ بن جائے اور وہ جلد از جلد اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش
کریں۔

یہ ہیں مختصر طور پر تدابیر جن سے مسلمانوں کی متاعِ ایمان
کی قیمت گرانے میں کام لیا گیا۔ اس پروگرام کا تیسرا جزو نظامِ
تعلیم ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ مُسلم قوم کو اپنے دین سے برگشتہ کرنے اور اُس کی

متاعِ ایمان کی قیمت گرانے میں حکمران قوم کی معاشی پالیسی اور مسیحی اداروں کی جارحانہ کارروائیوں کو بھی کافی دخل حاصل رہا ہے۔ لیکن اُسے بحیثیت ایک ملّت جو عظیم نقصان نظامِ تعلیم کی تبدیلی سے پہنچا ہے وہ سب سے زیادہ المناک اور افسوسناک ہے اس سے اس قوم کے نوجوانوں کے فکر و نگاہ کے زاویے بدلے، سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ معیارِ خیر و شر میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوا ایمان اور یقین کی جگہ ریب و تشکک نے لے لی۔ جو خوب تھا وہی بتدریج ناخوب ہو گیا اور ناخوب سراسر خوب بن گیا۔

دنیا کا ہر نظامِ تعلیم کسی خاص کلچر یا تہذیب کو پروان چڑھانے کے لئے معرضِ وجود میں آتا ہے اس لیے ہر زندہ قوم اپنے نظامِ تعلیم کو اس طریق سے مرتب کرتی ہے کہ اُس سے اُس کے نوجوانوں کی علمی و فکری ترقی ہو سکے۔ اور بڑے ہو کر جب وہ جنگ، گاہِ حیات میں عملاً شریک ہوں تو اُس بنیادی اور اساسی تخیل کی خدمت کریں۔ جس پر اُن کے قومی تشخص کا دار و مدار ہے۔ اسی وجہ سے جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر کرنا مقصود ہوتا ہے تو اُس کے نظامِ تعلیم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ تبدیلی بالکل تھوڑے عرصے میں پوری کی پوری قوم کو بانجھ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس پر دنیا کی ساری تاریخ گواہ ہے اور جس کے نتائج آج خود ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ قوم جس کی حرارتِ ایمانی سے کبھی پوری انسانیت سرگرمِ عمل تھی۔ آج ایک راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ وہ جس کے سوزِ یقین نے عقل اور علم کو چار چاند لگائے، تہذیب کے گیسو سنوارے، تمدن کو ترقی کے آخری زینے تک پہنچایا، وہ خود آج بے روح انسانوں کی بھیڑ نظر آتی ہے

یہ سب اس نئے نظامِ تعلیم کی کرشمہ سازی ہے۔

اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ بعض لوگ اپنی سادگی سے ابھی تک یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کا ہر نظام مفید اور کار آمد ہی ہوتا ہے اور انگریز نے جو نظامِ تعلیم ہمارے اس ملک میں نافذ کیا ہے۔ وہ چونکہ انگلستان میں مفید اور بہتر نتائج پیدا کر چکا ہے اس لئے یہ لامحالہ ہمارے لئے بھی تریاق کی حیثیت ہی رکھتا ہے اور ہماری ساری برائیوں کا واحد علاج ہے۔ اس لئے وہ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر جو نیا نظامِ تعلیم مرتب کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں اُس میں بعض مضامین کی کمی وبیشی تو کر دیتے ہیں مگر اس نظام کے بنیادی نقشہ میں قطعاً کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کا انداز قریب قریب وہی رہتا ہے۔ جو اوّل روز سے انگریزی نظامِ تعلیم کا ہے۔

اگر ان حضرات کی تجاویز اور مشوروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ علم تو محض حقائق کی پردہ کشائی ہے۔ اس لئے دُنیا کی ہر قوم کو جو اپنے اندر زندہ رہنے کا داعیہ رکھتی ہے ان حقائق کے قبول کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہونی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے چھوٹے بڑے "مصلحین" ہمیں برابر یہ مشورہ دیئے جا رہے ہیں کہ ہم آگے بڑھ کر مغربی علوم وفنون کو حاصل کریں اور اس طرح اُن فوائد سے متمتع ہوں جو یورپ کو تقریباً تین سو سال سے حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر خدا کا کوئی بندہ اس قوم کو یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ تم ان علوم کو بے شک حاصل کرو مگر یہ دیکھ لو کہ اس میں بہت کچھ زہر کی آمیزش بھی ہے تو "مصلحین" کا گروہ فوراً اس کے درپئے آزار ہو جاتا ہے اور اسے کٹھ ملا، ترقی کا دشمن، رجعت

پسند کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

یہ لوگ علم و فضل کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علم سے مراد صرف فطرت کے رازہائے سربستہ کی تلاش و جستجو نہیں بلکہ اس میں بہت سے دُوسرے عناصر اور عوامل بھی شامل ہیں اور دنیا میں آجتک کوئی محقق ایسا نہیں گزرا جس نے محض حقائق جمع کرنے میں اپنی قوتیں صرف کی ہوں۔ انسان جب بھی حقیقت کی تلاش میں نکلتا ہے تو کبھی خالی الذہن ہو کر نہیں نکلتا بلکہ اپنے ساتھ فکر و نظر کا زادِ راہ لیکر آگے بڑھتا ہے۔ پھر وہ اس نظامِ تکوینی کے اندر اور اس کے پرے جب حقائق کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ یونہی دیوانوں کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا نہیں پھرتا بلکہ ایک منزل کو دیکھتے ہوئے اُس کی طرف نہایت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ اُن راستوں کا تعین کرتا ہے جو اُسے جلد از جلد اُس منزل تک لے جاسکیں اور اُن پگڈنڈیوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اُسے دوسری سمت میں لے جانے والی ہوں۔ حقائق کبھی بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ ان سے ہمیشہ انسانوں نے نشانِ راہ کا کام لیا ہے۔ اگر سائنسدان اور فلاسفر اپنی جد و جہد کا محور صرف حقائق کا جمع کرنا ٹھہراتے تو یہ سارے علوم و فنون منتشر واقعات و حوادث کا طومار ہوتے ان میں وہ نظم و ترتیب ناپید ہوتی جو ان میں اب نظر آتی ہے۔ علم محض حقائق کا جمع کرنا نہیں بلکہ انہیں ایک سلک میں اس طرح منسلک کرنا ہے کہ ان میں ایک معنوی ربط پیدا ہو، اور اُن سے ہم ایک خاص نتیجہ تک پہنچ سکیں۔ ذہنی اور فکری آوارگی اور تحقیق و جستجو میں یہی بنیادی فرق ہے۔ حقائق کو جو چیز باہم مربوط کرکے ایک علم کی حیثیت دیتی ہے وہ ترتیب و تدوین ہی ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ مختلف نظریات

رکھنے والے انسانوں نے قریب قریب ایک قسم کے واقعات سے کس طرح مختلف نتائج مرتب کئے ہیں۔

تاریخ انسانی میں واقعات کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں انہیں دیکھ کر ایک انسان یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال میں انسانی بنیادی اخلاق ایک فیصلہ کن قوت ہے۔ جب قومیں اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے اخلاق سے متصف کر لیتی ہیں۔ تو انہیں ترقی حاصل ہوتی ہے اور جب ان میں بداخلاقی آجاتی ہے، جب اُن میں عیش و عشرت کا دَور دورہ ہوتا ہے تو وُہ تنزل کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ مفکر قوموں کے عروج و زوال کو اخلاقی ترقی اور انحطاط کی تاریخ قرار دیتا ہے۔

ایک دوسرا صاحب ِفکر انہیں واقعات کو اس طریق پر ترتیب دیتا ہے۔ کہ تاریخ کا ارتقا ذرائع پیداوار کی گردش نظر آتا ہے۔ وہ تاریخی حقائق سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں کوئی قدر معروضی اور ازلی و ابدی نہیں بلکہ یہ سب طریق پیدائش کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جب دَولت پیدا کرنے کے طریقے تبدیل ہوتے ہیں تو پُوری انسانی زندگی میں ایک انقلاب آتا ہے۔ ساری اقدار حیات بدل جاتی ہیں اور زندگی کے سارے شعبے ایک دوسرے سانچے میں ڈھلنے لگتے ہیں۔ ایک معاشی نظام جو درحقیقت ایک خاص قسم کے طریق پیدائش کا ہی مظہر ہے، صرف ایک زمانہ تک تو انسانی ضروریات و حاجات کی کفالت کرتا ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کے اندر سے اس کی مخالف قوتیں ظاہر ہوتی ہیں جو اس نظام کی تخریب و شکست کے درپے ہو جاتی ہیں۔ پھر ان دونوں کے مابین تنازع شروع ہو جاتا ہے۔

اس تنازع کے نتیجہ کے طور پر ایک نیا معاشی نظام وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے میدان میں جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں وہ اس دنیا میں ایک معاشی نظام اور اس کے مخالف نظام کے درمیان وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اخلاق و مذہب، علوم و فنون اور تمدن و معاشرت سب کے سب ابن الوقتوں کی طرح اپنے زمانے کے غالب معاشی نظام کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

اسی طرح ایک تیسرے صاحب اٹھتے ہیں اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے مادی کارخانے میں تخریب و تعمیر کا جو ہنگامہ برپا ہے۔ بگاڑ اور بناؤ کا جو فلم دکھایا جا رہا ہے، زوال و کمال کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے ان سب کے پیچھے روحِ مطلق اپنا کام کرتی ہے۔ عالمِ خارجی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روحِ مطلق کے سفرِ ارتقار کے لئے نشانِ منزل کا کام دیتا ہے

ایک اور صاحب آتے ہیں اور تاریخی شواہد سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخی ارتقار تحدّی (چیلنج) اور اس کے جواب میں انسان کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر انسان کے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ جب محض ماضی کے واقعات و حادثات کا مجموعہ ہے تو پھر فلسفۂ تاریخ کے ان نظریات میں اتنا اختلاف کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ کہ اگرچہ دنیا کے ہر مفکّر نے اپنے دل پسند نظریہ کی تشکیل میں انہی واقعات و حوادث پر انحصار کیا ہے جو تاریخِ انسانی کا مشترک سرمایہ ہیں مگر ہر ایک نے اُس تاریخی مواد کو اپنی نظر سے دیکھا ہے، اپنے ذہن سے ترتیب دیا ہے اور اس سے وہ نتائج

اخذ کئے ہیں جو اس کے اپنے طرزِ فکر سے مناسبت رکھتے تھے۔ اختلاف ان میں جو کچھ ہے وُہ حقائق کا نہیں بلکہ ترتیب و تعبیر اور استنتاج کا ہے۔

یہ معاملہ صرف معاشرتی علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ ترتیب و تدوین کے ہمہ گیر اور دور رس نتائج ان علوم میں بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جن کا تعلق قوانینِ فطرت سے ہے اور جن میں اختلاف کی بظاہر بہت کم گنجائش معلوم ہوتی ہے آپ علم طبیعیات کو ہی لیجئے اور دیکھئے کہ دو مختلف ذہن رکھنے والے افراد انہیں قوانین سے دو بالکل متضاد نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ایک آدمی قدرت کے مختلف مظاہر میں جب ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک مدبّر کی تدبیر کام کر رہی ہے اور یہ کائنات ایک نقشے اور پلان کے مطابق تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں جو کچھ موجود ہے وہ سب کسی علّت کا نتیجہ ہے اور سب سے بڑی علّت خود اللہ رب العالمین ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت اپنے اندر ایک گہرا مقصد رکھتا ہے اور اس لحاظ سے انسان اندھی اور بے مقصد قوتوں کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا نہیں بلکہ ایک صاحب مشیت و ارادہ ہستی ہے جو ان قوتوں سے جس طرح چاہے کام لے سکتی ہے۔

ایک دُوسرا مفکر انہی مظاہرِ قدرت سے یہ نتیجہ برآمد کرتا ہے کہ ہماری اس کائنات میں جو ربط دکھائی دیتا ہے وہ فطرت کے قانونِ یکسانیت (LAW OF UNIFORMITY) کی کرشمہ سازی ہے۔ مادہ ہی کے اندرونی قوانین نے اس کائنات کے مختلف اجزا کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے اس

عالم کے وجود کے لئے کسی بلند و بالا ہستی یا ذات باری کی کارفرمانی کا یقین ضروری نہیں۔ کیونکہ یہاں علّت اولیٰ خود مادہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کو کچھ معلوم نہیں، نہ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ عالم رنگ و بو کسی خدائی منصوبہ یا کسی بالاتر ذہن و شعور کی مصلحتوں کا نتیجہ نہیں اور نہ کوئی قوتِ حیات ہی ایسی موجود ہے جو اس مادہ پر کسی قسم کا اثر ڈال سکے۔ پھر انسان خود اس کائنات میں ایک عارضی اور اتفاقی شئے ہے جسے فطرت کی اندھی بہری قوتوں نے خلق کیا ہے وہ بیشک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصوّر کرتا رہے مگر یہ محض اُس کی ابلہ فریبی ہے۔

غور کیجئے کائنات کے موجود حقائق وہی ہیں۔ اس کے اندر کام کرنے والے قوانین بھی یکساں ہیں، مگر اس کے باوجود انہی کے مشاہدے سے یہ دو متضاد نتائج آخر کس طرح اخذ کئے جا رہے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی ترتیب چونکہ دو مختلف فکری بنیادوں پر کی گئی ہے اس لئے اُن کے نتائج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

ہماری ان گذارشات سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ علوم و فنون کے اندر اصل اہمیت حقائق کی نہیں بلکہ اُس بنیادی نقطۂ نظر کی ہے جس کے مطابق انہیں مرتب کیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے ہم کو انگریزی نظامِ تعلیم نے مغربی علوم سے صرف حقائق ہی نہیں دیئے بلکہ وہ بنیادی نقطۂ نظر بھی دے دیا۔ جس کے تحت وہ مرتب کئے گئے تھے۔ اب دیکھ لیجئے کہ پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم نے ان مغربی علوم و فنون کے حاصل کرنے میں جو قوتیں اور صلاحیتیں صرف کی ہیں اُن سے ہم کو بحیثیت مجموعی کیا فائدہ پہنچا ہے۔ پوری قوم ان علوم کو پڑھ

کے بعد ایک شدید قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ ہمارے نوجوان ایک طرف تو ان تصورات کو بالکلیہ ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے جو انہیں ماضی سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں اور دوسری طرف ہمارے مدارس اور کالجوں سے وہ ایسے افکار سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جو ان تصورات کی بالکل ضد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ علوم و فنون بجائے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچانے کے انہیں ایک سخت قسم کی کشمکش میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی چیز موجودہ نظامِ تعلیم میں سب سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ ہم اپنے ہاں جو ایک ذہنی خلفشار اور افلاس دیکھتے ہیں وہ اسی مغربی نظامِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہماری قوم کو فکری طور پر بالکل مفلس بنا کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ میرا تعلق برسوں سے اس نظامِ تعلیم کے ساتھ چلا آرہا ہے اس لئے میں اس کے مہلک اثرات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ میں نے طلباء کے مختلف طبقات میں گھوم پھر کر اس کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج تک جتنے طلباء سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ انہیں مندرجہ ذیل تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

ایک بہت بڑی تعداد اُن طلباء کی دیکھنے میں آئی ہے جو اس زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق کسی سنجیدہ غور و فکر کے قطعاً عادی ہی نہیں رہے۔ اُن کی حیثیت بالکل جانوروں کی سی ہے۔ جن کے سامنے بجز "چارے" کے کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ لوگ سوچ بچار کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے اس لئے ان کے ذہن ہر قسم کی کشمکش سے محفوظ رہتے ہیں۔ مغربی نظامِ تعلیم نے اس طبقے کو پوری طرح بیکار بنا دیا ہے اور ان سے سوائے اپنے پیٹ کے کسی دوسری خدمت کی توقع رکھنا بالکل عبث اور

بیکار ہے۔

دُوسرا طبقہ ایسا ہے جو مغربی علوم وفنون پڑھتا تو ہے لیکن ان کے بارے میں سوچتا بہت کم ہے مگر جونہی ان علوم کے اثرات اُس کے ذہن پر مترتب ہونے شروع ہوتے ہیں تو وہ خود اس کا زبان سے خواہ اقرار کرے یا نہ کرے اس کا یقین بہرحال متزلزل ہوتا جاتا ہے اور وُہ زندگی کے معاملات سے بالکل "شریفانہ" طور پر بے تعلق ہو جانے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جسے اسلام کے بنیادی نظریات و تصوّرات سے گہری عقیدت و وابستگی ہوتی ہے۔ وہ مغربی افکار کو باطل سمجھتا تو ہے مگر اس کے معاملہ میں مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ نہ تو وہ انہیں باطل ثابت کر سکتا ہے اور نہ اسلام کے متعلق کوئی مثبت علم رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغربی علوم سے بہت حد تک مرعوب ہو جاتا ہے اور اسلام کے اساسی تصوّرات کو اُن کے مطابق ڈھال کر اُس تضاد کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کے اپنے دل پسند نظریات اور مغربی افکار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مگر جب کسی نقطہ پر ان دونوں کے درمیان "تطبیق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وُہ اسلامی تصوّرات کو "ملّا" کی اختراع کہہ کر بڑی بے باکی سے ردّ کر دیتا ہے۔

میں نے دین کے لئے قابلِ رشک حمیت رکھنے والے طلبا میں بھی اس ذہنی انتشار کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور محسوس کیا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اُس سوزِ یقین سے خالی ہیں جو ایک مسلمان کا طرّہ امتیاز ہے اور جس کے بغیر عمل کی تڑپ پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان بیچاروں کی ساری قوتیں اسی ذہنی کشمکش کی نذر ہو جاتی

ہیں، اور وہ دینِ حق کے لئے بڑی مقدس آرزوئیں اور تمنائیں رکھنے کے باوجود اس کی کوئی خدمت نہیں کر پاتے۔

عمر کے اس دور میں جب ذہن ناپختہ ہو، جب فکری صلاحیتیں پوری طرح پروان نہ چڑھ چکی ہوں جب انسان کا دماغ باہر کے اثرات قبول کرنے کے لئے بالکل تیار رہتا ہو۔ اس وقت اگر زندگی کے واقعات و حوادث یا مظاہرِ کائنات کے متعلق کوئی نقطۂ نظر ایک شخص کے دل و دماغ میں بٹھا دیا جائے تو پھر اُسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اثرات عمر بھر قائم رہتے ہیں۔ پھر اُس شخص کی ساری زندگی اپنے اسی نظریے کی توجیہہ و تعبیر میں گزرتی ہے۔ وہ ہر آن اسی کوشش میں مصروف رہتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی کوئی ایسی تعبیر ہو سکے جس سے اُس کا بنیادی تصور میل کھاتا ہو۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے کہ مغربی نظامِ تعلیم میں ہم جو مضامین بچّوں کو پڑھاتے ہیں۔ اُن سے بحیثیتِ مجموعی اُن کے دماغ پر یہ اثر مرتب ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اِس کی ہر شے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے سکون اور قرار نصیب ہو۔ اس نظریہ میں ایک جزو بلا شبہ صداقت کا بھی ہے لیکن اس سے ہمارے نوجوان کو جس نتیجہ تک پہنچایا جاتا ہے وُہ یہ ہے کہ زندگی کے خارجی مظاہر بدل جانے سے اخلاقی اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اس زندگی میں کسی ابدی قدر یا کسی حتمی اصول کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اب وہ نوجوان جو ذرا جری اور بیباک ہوتے ہیں۔ وُہ صاف طور پر کہہ دیتے ہیں کہ اسلام ایک وقتی تحریک تھی جس نے اپنے زمانے میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی لیکن اب اُن

بدلے ہوئے حالات میں اس کی قطعاً کوئی افادیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقا
میں وہ لوگ جو اسلام کو چھوڑنا نہیں چاہتے وہ فوراً قرآن مجید میں سے اس نظ
کی تائید میں کوئی عبارت تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر سو
الرحمٰن کی یہ آیت کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ ہی استعمال ہوتی ہے پھر نئے افکا
نظریات کے قبول کرنے میں اگر کوئی چیز مانع نظر آتی ہے تو اسے دُور کرنے ک
لئے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ تو قیامت تک کھلا ہوا
اس لئے ہمیں اپنے حالات کے مطابق ان مسائل کے بارے میں سوچنا چاہیے
انہی میں سے ایک گروہ ایک قدم اور بڑھا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مرکزِ ملت کو
اس امر کا اختیار حاصل ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر دین میں جو
تبدیلیاں چاہے کر لے اور یہی اسلام ہے۔

باقی رہی وہ نہایت قلیل سی تعداد جس کی طبیعت اس قسم کی توجیہات پر مائل
نہیں ہوتی اس کا حال بھی اس طبقہ سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے ایما
کی عافیت اسی میں سمجھتی ہے کہ دنیا اور اس کے مسائل سے بالکل آنکھیں بند کر
اور زندگی کے دن اس طریق سے گزارے گویا کہ یہاں کوئی ایسا مسئلہ ہی نہیں جو
اس کی توجہ کا محتاج ہو۔ اس طبقہ کی آخری پناہ گاہ تصوّف ہے اور متصوفانہ خیالا
کے اتھاہ سمندر میں ہی ایک مدت تک گم رہ کر اس طبقہ کے لوگ اپنے خالق اور
مالک سے جا ملتے ہیں۔ اس کارگہ حیات میں یہ حضرات کبھی شریک نہیں ہوتے
اور یہاں بالکل غیر متعلق تماشائیوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات
میں خواہ کتنے نیک اور پاکباز ہوں مگر انسانیت ان سے قطعاً کوئی فائدہ

...یں اٹھا سکتی۔ جبر و استبداد یہاں کھلے بندوں پھرتا ہے۔ مگر انہیں اس کے
...دو کنے کی کبھی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ عملی نتائج جو مغرب کے صرف ایک نظریہ کو قبول کر لینے سے ایک
...مسلمان نوجوان کے ذہن پر مرتب ہوتے ہیں اور جب پوری قوم کو اسی قسم کے
...باطل نظریات پر پالا جائے تو اس قوم کی حالتِ زار کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا
...ہے۔ اس مغربی نظامِ تعلیم نے ہمارے ذہنوں کے اندر جو انتشار اور خلفشار پیدا
...کر رکھا ہے اُس نے ہمیں کسی کام کا نہیں چھوڑا اور یہی دراصل وہ عظیم نقصان ہے
...جو ہمیں اس نظامِ تعلیم سے پہنچا ہے۔

اب اگر ہم اصلاحِ حال کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ نہیں کہ ہم چند
...مضامین میں تغیر و تبدل کر دیں یا مغربی علوم و فنون کے ساتھ اسلامیات کے اجزا
...بڑھا دیں۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مغرب نے جن حقائق کو اپنے باطل نظریات
...کے مطابق مرتب کیا ہے انہیں ہم اس کے نظامِ فکر سے الگ کر کے اسلامی نقطۂ
...نظر کے مطابق پھر سے مرتب کریں۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر محال نہیں۔ آخر ہمارے
...اسلاف نے بھی تو کائنات کے انہی مظاہر اور حوادث کو ترتیب دے کر اپنے
...علوم و فنون اس طرح مدوّن کیے تھے کہ وہ اسلام کی بنیادی حقیقتوں سے ہم آہنگ
...ہو گئے تھے۔ انہی حقائق کے مطالعہ سے اُن کے اندر وہ عزم اور یقین پیدا ہوا
...تھا جسے دیکھ کر پہاڑ بھی ندامت سے جھک جاتے۔ جب تک ہم یہ کام نہیں کرتے
مسلمانوں کے اندر ایمان کی حرارت اور عمل کی تڑپ کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہماری ان گذارشات کو دیکھ کر ممکن ہے کوئی صاحب فکر یہ کہیں کہ جب

اس مغربی نظامِ تعلیم سے ہندوستان کی دوسری اقوام خصوصًا ہندوؤں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کو اس سے کیوں کر نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس اعتراض میں جو منطقی مغالطہ موجود ہے اُسے ہر وہ شخص بآسانی محسوس کرتا ہے جو ہندومت اور اسلام کے مزاج سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو۔

اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہے۔ اس وجہ سے جب کسی مسلمان پر فکر و عمل کا کوئی باطل نظام مسلط کیا جاتا ہے تو وُہ قدم قدم پر اپنے آپ کو ایک شدید کشمکش سے دوچار پاتا ہے ہمارا نوجوان اس گئی گزری حالت میں بھی اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام نے زندگی کو اخلاقی اقدار پر استوار کیا ہے مگر جب وہ کالج میں داخل ہو کر علم معیشت پر اپنے استاد کی پہلی تقریر سنتا ہے تو اُس وقت اُس کے کان میں یہ بات پڑتی ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے قطعًا کوئی تعلق نہیں۔ دولت کمانا اور صرف کرنا زندگی کا ایک الگ شعبہ ہے اور روحانی اور اخلاقی اقدار ایک دُوسرے شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی بنیادی تصوّر پر اُسے معاشیات کی ساری تعلیم دی جاتی ہے اور جلد وُہ وقت آجاتا ہے کہ اسلام سے محبّت کے باوجود وُہ اُسے ایک ناقابلِ عمل چیز یا قصّۂ پارینہ سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔

اسی طرح سیاست میں جو نقطۂ نظر اُسے اسلام دیتا ہے وُہ اس نقطۂ نظر سے قطعًا مختلف ہے جس سے وُہ ان مغربی طرز کے مدارس اور کالجوں میں رُوشناس کیا جاتا ہے۔ اسلام نے مملکت کے مُعاملے میں جو تعلیم اُسے دی ہے وُہ یہ ہے کہ مملکت ایک انسانی ادارہ ہے جو محض انسانوں کی خدمت کے لئے وجود میں آتا

ہے۔ وُہ مقصود بالذات نہیں۔ یہ اعتباری اور مجازی طور پر مقتدر ہے اس لئے
اس میں الُوہیت کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ امرِ اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل
نہیں جو ازلی و ابدی، اور واجب بالذات ہے۔ مگر درسگاہوں میں مملکت کے مسئلے
پر اُسے یہ تعلیم ملتی ہے کہ مملکت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وُہ اپنی
ذات میں خود ایک خدا ہے۔ اس لئے افراد کا فرض ہے کہ وُہ اس کی خاطر اپنے
آپ کو بالکل مٹا ڈالیں، وُہ اگر جئیں تو اسی کی چاکری کے لئے اور مریں تو اسی کے
آستانہ پر۔

یہی حال فلسفہ، اخلاق، معاشرت، شہریت، تاریخ اور دُوسرے علوم کا ہے
اسلامی تصوّرات اور مغربی تصوّرات میں اتنا بُعد ہے کہ اُن دونوں کو کبھی یکجا نہیں
کیا جا سکتا۔

اس حقیقت کا خود اُس قوم کے اصحابِ فکر تک نے اعتراف کیا ہے جو ہم
پر انگریزی نظامِ تعلیم مسلّط کرنے کی شدید آرزومند تھی۔ مسٹر بیلی جو حکومت ہند کے
امورِ داخلہ کے سیکرٹری تھے انہوں نے واشگاف الفاظ میں یہ کہا:۔

"اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقہ
تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اُن
کے ملّی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔ درحقیقت اس سے اُن
کے ضروری سے ضروری تقاضے بھی پُورے نہیں ہوتے یہ طرزِ تعلیم لازماً
اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی ملّی روایات کے منافی ہے۔"

اسی طرح مشہور انگریز ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر بھی اسی موضوع پر اظہارِ خیال

کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم جس نے ہندوؤں کو اُن کی صدیوں کی نیند سے بیدار کیا اور اُن کے کاہل عوام میں قومیت کے شریفانہ احساسات پیدا کر دیتے ہیں مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اور اُن کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے۔ بلکہ ان کے مذہب کی تحقیر کرتا ہے۔"

ایک دوسرے مقام پر انگریزی نظامِ تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے معاندانہ طرزِ عمل کی ہنٹر وجہ بھی بیان کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کا جس صحیح انداز سے تجزیہ کیا ہے وہ بڑا ہی قابلِ قدر ہے اور اپنے اندر غور و فکر کے بے شمار پہلو رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اکثر انگریزوں کی یہ عادت بن چکی ہے کہ وہ مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر غضبناک ہوتے ہیں کہ مسلمان اس تعلیم کو ٹھکراتے ہیں جسے ہم ایک ایک شخص تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ پھر جس آسانی کے ساتھ ملک کی دیگر اقوام نے اس تعلیم کو اپنا لینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کا انکار انگریز کو اور بھی برافروختہ کر دیتا ہے۔ چونکہ ہندو اس نظامِ تعلیم کے متعلق اپنے دل میں کوئی خلش محسوس نہیں کرتا لہٰذا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مسلمان کیوں خواہ مخواہ اپنے لئے تکلیف کا سامان پیدا کر رہے ہیں دراصل ہم نے اس امتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ جو بذاتِ خود اتنا ہی پرانا

ہے خوفناک انسان کا مذہبی رجحان ——— وہ امتیاز جس نے ہر زمانہ اور
ہر قوم میں خدائے واحد کی پرستش کرنے والوں کو مشرکین سے جدا رکھا۔
مشرک اپنی پرستش کے لئے بہت سے معبود رکھتے ہیں اور اس بنا پر
ان کے اعتقادات کے بھی کئی ایک حصّے ہو جاتے ہیں۔ گبن نے یونانیوں
کے متعلق جو آخری فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت ہندوؤں پر کہیں زیادہ ٹھیک
عائد ہوتا ہے۔ ناقابلِ تقسیم اور باضابطہ اعتقاد کی بجائے جو معتقدین کے
اعتقاد پسند دل و دماغ پر کلیتہً حاوی ہو جائے۔ یونانی علم الاصنام کی بناوٹ
ہزارہا قسم کے آزاد اور لچکدار حصّوں کا ایک مجموعہ ہے۔ لہٰذا ان معبودوں
کی پرستش کرنے والوں کو بھی اپنے مذہبی اعتقاد کی گہرائی اور درجے مقرر
کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اس قسم
کی آزادی ناممکن ہے۔ مذہب اُن سے غیر مشروط اور ناقابلِ تغیّر
اعتقاد کا خواہاں ہے۔ لہٰذا جو طریقہ تعلیم اُن کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز
کرے کسی سچّے مسلمان کو مطمئن نہیں کر سکتا۔

ہنٹر صاحب نے مسلم اور غیر مسلم کے بنیادی نقطہ نظر میں جو فرق ہے۔ اُس کی
بالکل صحیح نشاندہی کی ہے۔ ایک مسلمان چونکہ زندگی کا ایک خاص نقطہ نظر اور ایک
متعین اسلوبِ حیات رکھتا ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے
اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی ایسی چیز اصولاً گوارا کرلے۔ جو
اُس کے اساسی تخیّل سے متصادم ہو۔ اس کے برعکس ہندو کے نزدیک مذہب چونکہ
خالق و مخلوق کے مابین ایک پرائیویٹ رشتہ ہے۔ اس لئے حیاتِ انسانی کے ایک

مختصر سے گوشہ کو چھوڑ کر وُہ زندگی کے باقی شعبوں میں ہر قسم کے اصول و نظریات قبول کرنے پر بڑی آسانی سے آمادہ ہو سکتا ہے۔ یہی وہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر مسلم قوم کے بہی خواہوں نے انگریزی نظامِ تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ وہ ترقی کے دشمن نہ تھے۔ انہیں مغربی علوم و فنون سے بھی کوئی پُرخاش نہ تھی، انہیں انگریزی زبان سے بھی بحیثیت ایک زبان کے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اگر مخالف تھے تو اس بات کے تھے کہ اس نظامِ تعلیم کو جوں کا توں اپنا لیا جائے اور اس قوم کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہ رہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان حضرات کے خدشات بالکل صحیح ثابت ہوئے اور سرسیّد کا یہ خواب کہ "فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر" خواب ہی رہا، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ علی گڑھ نے نہ تو مذہبی نقطۂ نظر سے کبھی قابلِ رشک شہرت حاصل کی اور نہ وہ عام علمی اخبار ہی کا مرکز بن سکا۔ اس ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک اور بلند ہوں مگر اس کی علمی افادیت صرف اسی قدر تھی کہ وُہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کر دے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ میں مادیت اور ظاہر پرستی پیدا ہو گئی۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے اسلام کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے اور اسلام پر غیر مسلموں نے جو اعتراض کیے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے۔ لیکن یہاں عالم یہ تھا کہ

در بغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ

ن کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم وفنون کے متعلق اس غلط فہمی
ں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع
تا ہے۔ اسی طرح زبان کے مسئلہ کو بھی یہ لوگ محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں جس کا
ی تعلق کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب
سے نہیں ہے۔ لیکن یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ جس میں کوئی شخص مبتلا
سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ
یال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے۔ جس سے احساسات
نفسیات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں
ہو جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان
پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرزِ فکر اور ایک خاص قسم کی سیرت و کردار پر منتہی
ہوتا ہے۔ اسی کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات سے
وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں تہذیب کو زندہ
رکھنے اور فنا کر دینے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں
زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے۔ وہ
ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم اپنی زبان اور رسم الخط کو بدل دینے پر آمادہ ہو جائے،
اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کی حماقت کر
رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پنڈت جواہر لال نہرو جیسے "وسیع المشرب" انسان کی چند
تصریحات پیش کرتے ہیں:۔

" ایک قوم کی زبان کا مسئلہ ہمیشہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج سے

تین سو برس پہلے ملٹن نے فلورنس کے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ "کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو، خواہ وہ زبان بگڑی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجے کی خوشحالی و فلاح سے محروم کردی جاسکتی ہو جس وقت تک کہ اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں:۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ آوازیں بدل جاتی ہیں۔ اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مُردہ ہو چکی ہو۔" (میری کہانی جلد اوّل ص ۲۹۵)

اگرچہ زبان اور رسم الخط کی اہمیت پر بہت سی ایسی شہادتیں بھی نقل کی جاسکتی ہیں جو علمی حیثیت سے نسبتاً زیادہ وقیع ہیں مگر ہم نے قصداً یہ شہادت اس لئے پیش کی ہے کہ پنڈت جی کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو بڑے روشن خیال ہیں اور کبھی اس قسم کے معاملات پر غور و فکر کو رجعت پسندی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

تعلیمی زبان کی تبدیلی کے جو اثرات ہندوستان میں مسلمان قوم پر مرتب ہوئے وہ کسی شخص سے پوشیدہ نہیں ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے غلاموں کی زبان (ورنا کیولر) ہیں، جو کتب موجود تھیں انہیں نہ تو دریا برد کیا اور نہ انہیں جلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے صرف ذریعۂ تعلیم بدلا اور ترقی کے دروازے انگریزی جاننے والوں کے لئے کھول دیئے سو سال کی مدت کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑی مدّت نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ صرف سو سال کے اندر ہم کس انجام تک پہنچے۔ ہمارے نوجوان دنیا کمانے کی غرض سے انگریزی پر ٹوٹ پڑے۔ اور اپنی زبان سے، اپنے ماضی سے، اپنی قومی روایات سے، اپنے لٹریچر سے، اپنی تہذیب وتمدن سے اس طرح بیگانہ ہوئے گویا کہ وہ اس قوم کے افراد ہی نہیں ہیں۔ انگریزی زبان اپنے ساتھ ایک غیر قوم کے خیالات بھی لیئے ہوئے ان کے دل ودماغ میں نفوذ کرتی چلی گئی اور اس نے ان کو اندر سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ وُہ مقصد تقریباً حاصل ہو گیا جس کو پیش نظر رکھ کر میکالے اور اس کے ہم خیال لوگوں نے ذریعۂ تعلیم کو تبدیل کیا تھا۔

ترکی میں صرف رسم الخط بدلا گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی قوم آس پاس کی اُن مسلمان قوموں سے کٹ گئی جن کے ساتھ صدیوں سے اُس کا تعلق چلا آ رہا تھا۔ پھر اس کا رشتہ خود ترکی زبان بولنے والے اُن لوگوں سے بھی منقطع ہو گیا جو ترکی کے باہر پائے جاتے تھے اور ابھی پُرانے رسم الخط میں لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے اس تبدیلی سے ملک کے باشندوں کے لئے اُن کی پچھلی نسلوں کا سارا علمی وادبی کارنامہ ایک اجنبی چیز بن کر رہ گیا جو صدیوں کے دوران میں فراہم ہوا تھا۔ یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ پچھلی صدیوں میں ترک قوم کوئی ایسی چیز پیدا کرنے کے قابل

نہ تھی جس پر اس کے اخلاف فخر کر سکیں اور جسے زندہ رکھنے کے قابل پائیں اب
وہاں صورتِ حال یہ ہے کہ اس ملک کے کتب خانوں میں ترک علماء و فضلا اور
اہلِ قلم کی بیشمار کتابیں بیکار پڑی ہیں جنہیں پڑھنے اور سمجھنے والا ملک میں کوئی نہیں
ہے۔ اس معاملے میں لطف کی بات یہ ہے کہ اب مذہبی تعلیم کے ازسرِ نو آغاز کے
بعد ترکوں کو بھی یہ ضرورت پیش آئی ہے کہ اپنے اماموں، خطیبوں اور فوج کے مذہبی
معلّموں اور دیگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء کو اس قابل بنائیں کہ وہ پچھلے علماء
کے ترک علماء کی کتابیں پڑھ سکیں۔ چنانچہ اب وہاں اپنی ہی زبان کے رسم الخط کی تعلیم
اس طرح دی جارہی ہے جیسے کسی غیر ملکی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے اور دینیات
کے نئے نصاب میں پرانی ترکی زبان سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

عبد الحمید صدیقی

لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت

مجلس تعلیمات میں جو حضرات شریک ہیں اُن میں سے بعض اصحاب کی رائے
یہ معلوم ہوتی ہے کہ اب تک وُہ جس طریقے پر عمل پیرا رہے ہیں، اُسے برطانوی پارلیمنٹ
نے ۱۸۱۳ء میں قطعی طور پر متعین کر دیا تھا۔ اگر اس رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو اس
کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مجلسِ قانون ساز ہی کوئی قانون پاس نہ کرے، نظامِ تعلیم
میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اندریں حالات میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن مخالفانہ
بیانات کی ترتیب و تسوید میں حصّہ لینے سے احتراز کروں جو اس وقت ہمارے
پیشِ نظر ہیں اور جو کچھ مجھے اس موضوع پر کہنا ہے اس کے لئے اس وقت کا
انتظار کروں جب یہ مسئلہ کونسل آف انڈیا کے ایک رکن کی حیثیت سے میرے سامنے
پیش ہو۔

میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کسی قانون کے اندر محض الفاظ کے الٹ پھیر
سے وُہ معانی کس طرح پیدا کئے جا سکتے ہیں جو اس وقت اس میں سے اخذ کئے
جا رہے ہیں۔ اس میں اُن علوم اور زبانوں کا جو ہمیں پڑھانی مقصود ہیں کوئی ذکر تک
نہیں ہے۔ اس میں تو محض اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ احیائے ادب
ہندوستانی فضلاء کی حوصلہ افزائی اور برطانوی علاقوں کے باشندوں میں مختلف
علوم کی ترویج و اشاعت کے لئے حکومت نے ایک رقم مختص کر دی ہے۔ بعض
لوگ منطقی استدلال سے اور بعض ایک بدیہی حقیقت سمجھتے ہوئے اس امر کے

دعویدار ہیں کہ ادب سے پارلیمنٹ کی مراد عربی اور سنسکرت ادب ہی ہو سکتی ہے۔
وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستانی جو ملٹن کی شاعری، لاک کی الٰہیات، اور نیوٹن کی طبعیات کا شناسا ہے اُسے "دیسی عالم" کے معزز لقب سے سرفراز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لقب تو انہی افراد کو زیب دیتا ہے جنہوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں کُشا گھاس کے مختلف استعمالات اور گیان کے اسرار و رموز پائے ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون کی یہ تعبیر کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے میں اس سے ملتی جُلتی ایک مثال پیش کرتا ہوں، فرض کیجئے کہ پاشائے مصر۔ وہ مصر جو کبھی علم و فن کے اعتبار سے یورپین اقوام سے بھی ممیز اور ممتاز تھا مگر اب بہت پسماندہ ہے ——— ایک خاص رقم ادب کی توسیع و اشاعت اور وہاں کے علماء کی امداد کے لئے وقف کرتا ہے۔ تو کیا اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ پاشا کے پیشِ نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کی قلمرو میں رہنے والے نوجوان یا تو تصویری خطوط میں برسہا برس تک منہمک رہیں، یا اُن عقائد و نظریات میں اپنی صلاحیتیں کھپائیں جو اوسائرس کے قصّے کہانیوں میں گم ہیں، یا اُن مذہبی رسوم کی تلاش و جستجو میں قوتیں صرف کریں جن کی وساطت سے ماضی میں بلّی اور پیاز کے سامنے اظہارِ عقیدت کیا جاتا تھا۔ کیا آپ اُسے تضاد سے تعبیر کریں گے؛
اگر وہ رقم نوجوانوں کو کاواک حروف متعیّن کرنے کی بجائے انگریزی اور فرانسیسی زبان اور وہ سارے علوم جن کے لئے یہ زبانیں کلید کی حیثیت رکھتی ہیں سکھانے پر صرف کی جائے؟[1]

---

[1] میکالے صاحب کا یہ منطقی مغالطہ قابلِ غور ہے۔ وہ دراصل چاہتے تھے کہ باقی مقیم

قدیم نظام کے حامی جن الفاظ کا سہارا لیتے ہیں، اُن سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا، بلکہ ان کے بعد جو الفاظ موجود ہیں اُن سے قطعی اور حتمی طور پر اس کے بالکل برعکس نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ایک لاکھ کی رقم ہندوستان میں صرف احیائے ادب کے لئے ہی مختص نہیں کی گئی (اگرچہ اس نظریہ کے حامی سارا زور اسی جملہ پر صرف کر رہے ہیں) بلکہ اس کا مقصد انگریزی علاقوں کے رہنے والے لوگوں میں مختلف علوم و فنون کی ترویج و ترقی ہے۔ ان الفاظ میں اُن تمام تبدیلیوں کے لئے وجہ جواز موجود ہے جن کے لئے میں پیہم کوشش کر رہا ہوں۔ اگر کونسل میری اس تعبیر سے متفق ہو تو پھر کسی نئے قانون کے وضع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اگر وہ اس امر میں مجھ سے اختلاف کرے تو پھر میں ایک ایسے مختصر قانون کا مسودہ تیار کردوں گا جو ۱۸۱۳ء کے منشور کی اس بندش کو جو اس راہ کا سنگ گراں ہے کالعدم کردے گا۔

میں جس زاویۂ نگاہ سے بحث کر رہا ہوں اس کا تعلق طریق کار سے ہے۔ مگر

دلچسپ نکتہ! یہ ہے کہ کمپنی بہادر نے جو رقم احیائے علوم کے لئے مختص کی تھی اسے عربی اور سنسکرت کتابوں کی اشاعت اور اُن زبانوں کی تعلیم پر صرف کرنا بند کردیا جائے، اور انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے وہ استدلال پیش کیا ہے جو اُوپر آپ دیکھ رہے ہیں۔ گویا پاشائے مصر اگر کوئی رقم اس مقصد کے لئے مختص کرے تو اسکے دو ہی مصرف ممکن ہیں یا تو تین چار ہزار برس پہلے کی مصری تہذیب کے مطالعہ پر اسے صرف کیا جائے یا پھر انگریزی اور فرانسیسی زبان کی تعلیم پر۔ رہی تیسری صورت کہ خود پاشا کے اپنے زمانے کی عربی زبان اور اسکے علوم پر اسے صرف کیا جائے۔ یہ میکالے صاحب کے نزدیک خارج از بحث تھی۔

مشرقی طرز تعلیم کے پرستار اس معاملہ کو بالکل دوسری نہج پر سوچتے ہیں۔ اگر اُن کے استدلال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر کسی تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اسی نظام تعلیم کو حاصل ہے جو اِس وقت ملک میں رائج ہے۔ اس لئے اگر اُس فنڈ کو جو ابھی تک صرف عربی اور سنسکرت کی توسیع و اشاعت پر خرچ ہوتا رہا ہے کسی اور مصرف میں استعمال کیا جائے تو ہمارا یہ فعل خالص تصرفِ بیجا کے مترادف ہوگا۔ میری سمجھ میں یہ چیز ابھی تک نہیں آئی کہ وہ کس منطق کی رو سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ سرکاری خزانہ سے جو مالی امداد ادب کی ترقی کے لئے عام طور پر دی جاتی ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے اُن اعانتوں سے بالکل مختلف نہیں ہے جو حکومت رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے دیتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم نے ایک مقام کو صحت کے نقطۂ نظر سے موزوں سمجھتے ہوئے وہاں ایک صحت گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے اس فیصلے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اگر ہمیں متوقع نتائج نہ بھی حاصل ہوں، تب بھی ہم اس صحت گاہ کو اسی مقام پر قائم رکھنے کے لئے اصرار کرتے رہیں یا مثلاً ہم ایک بند کی تعمیر شروع کرتے ہیں۔ کیا ہمارا یہ فعل دیانت کے خلاف ہوگا اگر ہم ایک مرحلہ پر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کام کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ اس کی تعمیر روک دیں؟ ملکیت کے حقوق بلاشبہ بڑے مقدس اور واجب الاحترام ہیں مگر ان حقوق کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز سے پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بالعموم ان کے تحت ایسی چیزوں کو خواہ مخواہ کھینچ لاتے ہیں جو فی الواقع اُن کے حدود میں نہیں آسکتیں۔ جو لوگ غلط استعمالات و تصرفات کو حقوقِ ملکیت کی حُرمت کے نام پر جائز ٹھہراتے ہیں وہ درحقیقت ملکیت کے اصول کو اس ذلت اور بدنامی کے خطرے

میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جو غلط تصرفات کے لئے مقدر ہے اگر حکومت نے کسی فرد کو یہ یقین دلایا ہو یا اور کچھ نہیں تو اس نے اپنے کسی قول یا فعل سے کسی شخص کے ذہن میں بجا طور پر یہ توقع ہی پیدا کر دی ہو کہ وہ سنسکرت یا عربی کے استاد یا طالبعلم کی حیثیت سے ایک خاص مشاہرہ پاتے گا، تو میرا یہ فرض ہے کہ میں اس شخص کے مالی مفادات کی حفاظت اور پاسبانی کروں۔ میں تو یہاں تک جانے کے لئے بھی تیار ہوں کہ عوامی اعتماد کو قائم رکھنے کی خاطر جہاں تک ممکن ہو افراد کے ساتھ فیاضی برتی جائے۔ خواہ وہ فیاضی غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اس بات کا دعویٰ کرنا مجھے تو بالکل بے معنی نظر آتا ہے کہ حکومت نے بعض ایسی زبانوں اور ایسے علوم کی سرپرستی کا ذمہ لیا ہے جو فضول اور ناکارہ ہیں [۱]۔

تعلیماتِ عامہ کے آئین وضوابط میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی عہد و پیمان باندھا ہے یا یہ رقم جن مقاصد کے لئے وقف کی گئی ہے۔ وہ مقاصد بالکل بگے بندھے اور غیر متبدل ہیں تاہم اگر یہ چیز موجود بھی ہوتی تب بھی میں اُسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہمارے آباؤ اجداد ہمیں کسی ایسے معاہدے کا پابند کرنے کے مجاز تھے۔ فرض کیجئے کہ گزشتہ صدی میں کارپردازانِ سلطنت پُوری سنجیدگی سے یہ قانون وضع کر گئے ہوتے کہ رعایا کو ابدالآباد تک اسی طریقہ سے چیچک کے ٹیکے لگوائے جائیں جو اُن کے عہد میں رائج تھا تو کیا اب جینر (JENNER) کے جدید انکشاف کے بعد حکومت کا اس طریقہ

[۱] میکالے کا یہ استدلال اس مفروضے پر مبنی تھا کہ عربی اور سنسکرت بیکار زبانیں ہیں اور ان کے سب علوم فضول ہیں۔

پر اصرار کرنا مناسب ہوگا؟ یہ مواعید جن کی تعمیل یا انجام دہی کی ذمّہ داری نہ کسی فرد واحد پر عائد ہوتی ہے اور نہ جن کی پابندی سے کوئی کسی کو آزاد کر سکتا ہے، یہ مستقل حقوق جو در حقیقت کسی کو بھی بالاستقلال حاصل نہیں ہوتے، یہ عجیب ملکیت جس کا فی الواقع کوئی مالک نہیں، یہ نرالی چوری جس میں کسی کا مال چرایا بھی نہیں جاتا، ممکن ہے مجھ سے اعلےٰ اور ارفع دماغ کے لوگ ان باتوں کو سمجھ سکتے ہوں۔ لیکن میرے ذہن کی رسائی سے تو بہر حال یہ ماوراء ہیں۔ میرے نزدیک استدلال کا یہ طریق محض الفاظ کی بازیگری ہے جس کے ذریعہ ہندوستان اور انگلستان میں ہر اس غلط کارروائی کی بالالتزام مدافعت کی جاتی ہے جس کے لئے اور کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔[1]

میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایک لاکھ کی رقم بالکل گورنر جنرل با جلاس کونسل کی مرضی پر موقوف ہے اور ہندوستان میں علم کی ترقی کے لئے وُہ جس طرح بھی مناسب سمجھیں اسے صرف کرنے کے پُوری طرح مجاز ہیں۔ وہ جس طرح اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ میسور میں شیر مارنے والوں کا انعام گھٹا دیں، یا معابد میں زمزمہ

---

[1] یہاں میکالے نے محض شکوہ لفظی کے بل پر سخت مغالطہ دیا ہے۔ فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اگر یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ اسی سے وصول کردہ ٹیکسوں کا ایک حصّہ اس کی زبان اور اس کے علوم کی ترقی پر صرف کرے گی تو اس وعدے سے وہ ان دلیلوں کی بنا پر کیسے سبکدوش ہو سکتی تھی جو اُوپر بیان ہوئی ہیں اور اس وعدے کو آخر چیچک کے ٹیکوں والی مثال سے کیسے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ کیا محکوم قوم کی زبان اور علوم کو ترقی دینے کا مفہوم لازماً یہی ہو سکتا تھا کہ محض ان کے قدیم علوم کی اشاعت کی جائے اور ان میں نئے علوم منتقل کرنے کا کوئی تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا؟

پردازی پر آئندہ کوئی رقم صرف نہ کریں، بالکل اسی طرح انہیں یہ فیصلہ کر دینے کا بھی پورا اختیار ہے کہ جو رقم عربی اور سنسکرت کی سرپرستی کے لئے صرف کی جارہی ہے، اُسے اب اس مصرف میں نہ لایا جائے۔

اب میں معاملے کے اصل پہلو کو لیتا ہوں۔ ہمارے پاس ایک رقم ہے جسے حکومت کے فرمان کے مطابق اس ملک کے باشندوں کی علمی ترقی پر صرف کرنا مقصود ہے۔ اب سادہ سا سوال یہ ہے کہ اس رقم کا بہترین مصرف کیا ہو سکتا ہے؟ تمام طبقے (یعنی حکمران قوم کے طبقے) اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان کے اس حصّہ کے رہنے والے جو مختلف بولیاں بولتے ہیں وہ ادبی اور علمی معلومات سے یکسر تہی دامن ہیں۔ پھر اُن کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم اور انداز بیان اس حد تک ناتراشیدہ ہے کہ جب تک انہیں کسی اور ذریعہ سے وسیع نہ کیا جائے۔ ان میں کسی قابل قدر علمی کام کو منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چیز اب ایک بدیہی حقیقت کے طور پر

ملہ یہ پہلا مفروضہ ہی سراسر غلط تھا جس پر میکالے نے اپنے استدلال کی پوری عمارت اٹھائی تھی۔ اس کے قریب زمانے ہی میں حیدر آباد کے شمس الامراء اور بعض دوسرے لوگوں نے ریاضی اور فلکیات اور دوسرے سائنٹفک علوم پر اردو زبان میں کتابیں شائع کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ زبان ہر قسم کے علمی مضامین ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے پھر اُس کے تھوڑی مدت بعد ہی ڈپٹی نذیر احمد نے تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کا ترجمہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ قانون کے باریک سے باریک مسائل بھی اردو زبان میں بخوبی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اگر انگریز اپنے جھوٹے ترفع اور تعصب کی بنا پر یہاں کی زبانوں کو حقیر سمجھتے تھے اور ان کے ناکارہ ہونے پر متفق تھے تو یہ اس فیصلے کیلئے کوئی دباقی صفحہ ۴۶ پر)

سامنے آچکی ہے کہ اس ملک کے جو طبقے اعلیٰ تعلیم پانے کے وسائل رکھتے ہیں۔
ان کا ذہنی نشوونما دیسی زبانوں کے سوا کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے
وہ زبان کونسی ہو سکتی ہے؟ کمیٹی کے نصف ارکان کی رائے میں یہ زبان صرف

بقیہ ص۴۵ معقول دلیل نہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کے لئے ان کی مادری زبان کے بجائے ان کے حکمرانوں کی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ بعد میں حیدرآباد کی جامعۂ عثمانیہ کے تجربے کو جو شخص بھی دیکھے گا اس سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ میکالے نے یہ الفاظ لکھ کر دراصل اُس وقت کے لوگوں کو ایک شرمناک دھوکا دیا تھا۔ میکالے کے زمانے کی اُردو اُس دور کی انگریزی سے بدرجہا بہتر حالت میں تھی جب کہ لاطینی اور یونانی کے سوا یورپ کی کسی زبان میں بھی کوئی علمی سرمایہ نہ تھا۔ اگر اُس وقت میکالے کا استدلال اس کے حق میں استعمال کیا جاتا تو آج انگریزی زبان کسی شمار میں نہ ہوتی۔

لہ قارئین کرام کو اس پوری تقریر میں اس قسم کے فقرات بکثرت ملیں گے جن سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو نیا نظامِ تعلیم ہم رائج کر رہے ہیں اس سے ہمارا اپنا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ اسی ملک کے رہنے والوں کی خواہش اور مفاد کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا ہے۔ اس سرزمین کے ہر فرد نے پوری طرح یہ محسوس کر لیا ہے کہ وہ سارے علوم و فنون جو اُسے اسلاف سے ایک مقدس ورثہ کے طور پر ملے ہیں۔ وہ بالکل عبث اور بیکار ہیں۔ اور انگریز فرمانروا ان سے جتنی جلدی اس کا پیچھا چھڑا دیں اتنا ہی بہتر ہے۔ پھر ذہنی نشوونما سے میکالے کی مراد یہ ہے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جائے جو خون و رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے خالص انگریز ہو جیسا کہ آگے چل کر خود اس نے واضح کر دیا ہے

انگریزی ہے۔ باقی اس مقام پر عربی اور سنسکرت کو فائز کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس امر کی چھان پھٹک کی جائے کہ کونسی زبان تعلیم و تعلّم کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔

مجھے نہ تو عربی سے کوئی واقفیت ہے اور نہ سنسکرت[1] ہی سے۔ مگر ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے میں جو کچھ کر سکتا تھا اس میں کوئی کسر میں نے نہیں اٹھا رکھی۔ میں نے عربی اور سنسکرت کی مشہور و معروف کتابوں کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اُن لوگوں سے بھی جنہیں ان مشرقی زبانوں پر دسترس حاصل ہے ——— خواہ وُہ اس ملک کے رہنے والے ہوں یا انگلستان کے ——— تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ میں اس بات پر بھی تیار ہوں کہ مستشرقین جو اہمیت ان علوم کو دیتے ہیں وہی میں بھی دوں[2]۔ ان حضرات میں مجھے کوئی

---

[1] صاحب کی جسارت کی داد دیجئے کہ وہ بغیر واقفیت کے کسی زبان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

[2] یہ مستشرقین جن کی رائے کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے حاکم قوم کے ہی افراد ہیں۔ وُہ مشرقی علوم سے کسی حد تک واقف تو ضرور ہیں مگر غلام قوم اور اُن کے علمی سرمایہ کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بالکل وہی ہے جو دُوسرے انگریزوں کا ہے۔ پھر مستشرقین کے جو علمی کارنامے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں انہیں دیکھ کر نہ تو ہمیں ان کے علم کے بارے میں کوئی حُسن ظن پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اُن کی نیت بخیر معلوم ہوتی ہے۔ اُن کی ساری کوشش زیادہ تر ہماری تہذیب اور تاریخ کے بارے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے پر مرکوز رہی ہیں اور یہی ان کے نزدیک قومی خدمت اور علمی کارنامہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آج ہمارے اندر (باقی صفحہ

ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا جو اس حقیقت سے انکار کرے کہ یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے سارے ادبی سرمایہ پر بھاری ہے۔[1] مغربی ادب کی حقیقی فوقیت اور برتری کا کمیٹی کے اُن ارکان نے بھی اعتراف

(بقیہ صفحہ ۴۷) جس قدر ذہنی خلفشار موجود ہے اس میں ان کی حضرات کی "خدماتِ جلیلہ" کا بہت بڑا حصہ ہے۔

[1] میکالے صاحب اپنے علم و فضل کے باوجود اس سادہ سی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے کہ ایک قوم کے زمانۂ شباب کو دُوسری قوم کے دورِ انحطاط کے بالمقابل رکھ کر ان دونوں کا موازنہ کرنا عقل و انصاف کے خلاف ہے۔ مسلمان بھی کبھی دنیا کی ایک اقبال مند قوم تھی اور اُس نے اپنے دَورِ عروج میں جس قدر حیرت انگیز ترقی کی اس کا اعتراف خود میکالے کے ہم مشرب بھی کرتے ہیں۔ یہاں ہم چند اقتباسات درج کرتے ہیں:-

"ہماری سائنس پر عربوں کا جو احسان ہے وہ صرف چونکا دینے والے انکشافات یا انقلابی نظریات پر مشتمل نہیں بلکہ سائنس اس سے بھی زیادہ عربی تہذیب کی ممنونِ احسان ہے۔ کیونکہ دراصل سائنس کو اسی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ دنیائے قدیم قبل سائنس کی دُنیا تھی۔ یُونانیوں کی فلکیات و ریاضیات باہر سے درآمد ہوئی تھیں۔ چنانچہ یُونانی ثقافت انہیں پورے طور پر کبھی جذب نہ کر سکی۔ اس میں شک نہیں کہ یُونانی اپنے علوم کو مرتب کرتے تھے، عمومیت دیتے تھے، نظریات قائم کرتے تھے لیکن صابرانہ تحقیق و تفتیش، مثبت علم کی فراہمی، سائنس کی باریک بینی۔ مفصل و طویل مشاہدات اور تجربی تجسس یہ سب لوازمِ علمی یونانی مزاج سے قطعاً بعید تھا (بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

ہے جو مشرقی نظامِ تعلیم کے حق میں ہیں[1]۔

بقیہ حاشیہ ۴۸) تھے۔ قدیم کلاسیکی دنیا میں صرف پہلانی اسکندریہ کے اندر سائنسی عمل کی سعی کا سراغ ملتا ہے۔ ہم جس چیز کو سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ان امور کا نتیجہ ہے کہ تحقیق کی نئی روح پیدا ہو گئی۔ تفتیش کے نئے طریقے معلوم کئے گئے۔ تجربے، مشاہدے اور پیمائش کے نئے اسباب اختیار کئے گئے۔ ریاضیات کو ترقی دی گئی اور یہ سب کچھ ایسی شکل میں رونما ہوا جس سے یونانی بالکل بے خبر تھے۔ دنیائے یورپ میں اس روح کو اور ان اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔"

(تشکیل انسانیت از رابرٹ بریفالٹ ص ۲۴۸)

"وہ مسائل جو مسلم فلاسفہ کو در پیش تھے وہ مغربی مفکرین کو بھی برابر پریشان کرتے رہے۔ ——— اگرچہ مسلم فلاسفہ کا اندازِ بحث بڑا علمی تھا۔ مگر انہوں نے کبھی بھی اپنی تحقیقات کو مذہبی اعتقادات پر مسلط نہیں ہونے دیا۔۔۔ یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہ ہو گا کہ عیسائی فلاسفہ کی یہ ترقی فارابی، ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کے افکار و نظریات کی رہینِ منت ہے۔"

(اسلام اور عرب از روم لانڈو)

"جب مغرب سن رشد کو پہنچا اور اس نے گہرے علم کے لئے پیاس محسوس کی، جب اس کے اندر پرانے افکار سے شناسائی پیدا کرنے کا احساس بیدار ہوا تو اس نے سب سے پہلے یونانی ماخذ کی طرف نہیں بلکہ عربی ماخذ کی طرف توجہ کی (مقدمہ تاریخ سائنس جارج سارٹن) (۱ کا حاشیہ ص ۵۰ پر)

یہ امر قریب قریب متفق علیہ ہے کہ مشرقی ادب میں سب سے نمایاں مقام شاعری کو حاصل ہے۔ میری آج تک کسی ایسے مستشرق سے ملاقات نہیں ہوئی جو اس بات کا دعویدار ہو کہ عربی اور سنسکرت شاعری کو یورپین شاعری کے مقابلہ میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ہم اُن تحقیقات کے دائرہ سے باہر نکل کر جن کا محور محض تخیل ہے اُن علوم کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں جو حقائق پر مبنی ہیں، جن میں تجربہ و مشاہدہ بطور اساس کام کرتے ہیں تو اس وقت یورپ کی فضیلت مسلّم ہو جاتی ہے۔ میرے اس دعوے میں مبالغہ کا قطعاً کوئی شائبہ نہ ہوگا۔ اگر میں کہوں کہ وہ سارا تاریخی مواد جو سنسکرت کی کتابوں سے اکٹھا کیا گیا ہے؛ قدر و قیمت کے اعتبار سے اُس مواد سے کہیں کم ہے جو انگلستان کے ابتدائی درجوں کے معمولی ملخصات میں موجود ہے۔ علم طبیعیات یا علم الاخلاق کے ہر شعبہ میں ان دونوں قوموں کے مابین تفاوت کا تناسب قریب قریب یہی ہے۔

پھر اصل صورتِ حال کیا ہوئی؟ ہمیں ایسے لوگوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ہے جنہیں فی الحال ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے لامحالہ انہیں غیر مُلکی زبان ہی سکھانی ہوگی۔ اس سلسلہ میں جو استحقاق ہماری اپنی زبان کو حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ یُورپ کی مختلف زبانوں میں یہ ایک امتیاز کی حامل ہے اس میں شاعری کا ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔ جو حسنِ تخیل کے لحاظ سے اس سرمایہ سے کسی طرح فروتر نہیں جو ہمیں یُونان سے ورثہ میں ملا ہے۔ فصاحت

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ سابق) واضح رہے کہ کمیٹی کے سارے ارکان انگریز تھے۔ مشرقی نظامِ تعلیم کی حمایت جو اصحاب کر رہے تھے ان میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔

طلاقت اور خطابت کے جو اعلیٰ نمونے ہو سکتے ہیں وُہ سارے اس میں موجود ہیں، اس کے اندر جو تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں کوئی دُوسری زبان اُن کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ اس کی تاریخ ایک اخلاقی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے عدیم المثال ہے۔ اس میں انسانی زندگی اور انسانی فطرت کی نہایت صحیح اور دلفریب عکاسی پائی جاتی ہے۔ پھر اس میں اخلاقی، سیاسی، فقہی، تجارتی اور مابعد الطبیعی مسائل پر نہایت ادق بحثیں بھی ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں ہر تجرباتی علم کے متعلق مکمل اور صحیح حقائق کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جس کے ذریعے صحت کی حفاظت، نوعِ بشری کے آرام و آسائش اور انسانی عقل و خرد کو جلا دینے میں انسان کو اچھی خاصی مدد ملی ہے۔ جو شخص اس زبان سے واقف ہے۔ وہ اُس سارے علمی سرمایہ تک فوری دسترس رکھتا ہے جو دُنیا کی دانشمندانہ قوموں نے گزشتہ نوّے صدیوں میں اکٹھا کیا ہے۔ اس لئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ انگریزی ادب کو اُس سارے ادبی سرمایہ پر نمایاں فوقیت حاصل ہے جسے دُنیا کی مختلف قوموں نے آج سے تین سو برس پیشتر تخلیق کیا تھا یہی نہیں انگریزی زبان ہندوستان کے حکمران طبقے کی زبان[1] ہے۔ اس ملک کے جو اُونچے طبقے حکومت کے مراکز میں رہتے ہیں وہ بھی اسی زبان کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے ہیں اور مستقبل قریب میں مشرقی سمندروں میں تجارت بھی اسی زبان کی وساطت سے کی جائے گی۔ پھر یہ دو ایسی اُبھرتی ہوئی قوموں کی زبان ہے جو جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا میں نشوونما پا رہی

---

[1] یہ انگریزی زبان کا وُہ اصل استحقاق تھا۔ جس کی بناء پر اسے ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ہیں اور ہندوستان سے اُن کا رابطہ دن بدن مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ اب خواہ ہم اس زبان کے ذاتی اوصاف کی بنا پر یا ملک کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر کوئی قدم اٹھائیں، عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ تمام غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زبان ہی ہماری رعایا کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔

اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ جب ہمیں ایک زبان کی تعلیم دینے کا اختیار حاصل ہے تو کیا پھر بھی ہم اُن زبانوں کی تعلیم دیں گے جن میں مسلّمہ طور پر کسی موضوع سے متعلق بھی کوئی ایسی قابلِ قدر کتاب نہیں ملتی جسے ہماری زبان کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہو؟ جب ہم یورپین علوم پڑھانے کے معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو کیا پھر بھی ہم اُن علوم کی تعلیم دیں گے جو یورپین علوم سے جہاں کہیں مختلف ہیں، وہاں اُن کی لغویت مسلّمہ طور پر نمایاں ہے

جب ہم ایک صحیح فلسفہ اور تاریخ کی سرپرستی کرنے پر قدرت رکھتے ہیں تو کیا جب سے ہم سرکاری دولت کے صرف سے وہ طبّی اُصول پڑھائیں، جن کو دیکھ کر انگلستان کا نعل بند بھی خفت محسوس کرتا ہے[۱] ۔ وہ علمِ ہئیات جس پر

---

[۱] انگلستان کا نعل بند تو ممکن ہے مسکرا دے مگر کوئی ہوشمند اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر گستاولی بان اپنی مشہور تصنیف تمدّنِ عرب میں تو عربوں کی برتری کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:۔

"عربوں کی طبّی ترقیاں زیادہ تر فن جراحی، علاماتِ امراض، قرابادین اور علم الادویہ میں ہیں۔ انہوں نے علاج کے بہت سے طریقے ایجاد کیے ہیں۔ مثلاً میعادی بخار (TYPHOID) میں پانی کا استعمال کئی صدیوں (باقی ص۵۳ پر)

نگریزی سکولوں کی بچیاں بھی خندہ زن ہوں گی[1]۔ وہ علم تاریخ جو تیس تیس فٹ

بقیہ حاشیہ ص۵۲ تک متروک ہو جانے کے بعد اب دوبارہ جاری ہوا ہے۔ قرابادین میں انہوں نے بہت سی دوائیں بڑھائی ہیں۔ مثلاً خیار شنبر۔ سنا۔ ریوند چینی تمر ہندی، کچلہ۔ حب القرمز۔ کافور۔ الکحل وغیرہ اور ادویہ مرکبہ کے ڈھ گویا موجد ہیں اور اکثر مرکبات جو اس وقت مستعمل ہیں۔ شربت۔ لیپ ضماد۔ دہنیات۔ روغن۔ عرقیات اُن ہی سے ہم کو پہنچے ...... فنِ جراحی کی بھی ابتدائی ترقی عربوں سے ہوئی اور زمانۂ حال تک اُن ہی کی تصنیفات پر یورپ کے طبّی مدارس کا دار و مدار رہا۔" (ص۴۵۵)

[1] جس علمِ ہیئت کی اس قدر تضحیک کی جا رہی ہے۔ اُس کے متعلق تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عربوں نے اس میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اس علم میں ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ دسویں صدی سے حسابات میں مماسہ کا استعمال

۲۔ اجرام سماوی کی حرکات کی زیچوں کا مرتب کرنا

۳۔ اعوجاج منطقہ البروج اور اس زاویہ کے بتدریج کم ہونے کی نہایت درست تحقیقات۔

۴۔ استعمال معدل انہار کا ٹھیک معلوم کرنا

۵۔ سب سے پہلے سال کی درست مُدّت کا تعیّن کرنا

۶۔ چاند کے زیادہ سے ارتفاع کا اختلاف کرنا۔

۷۔ چاند کے اس تیسرے اختلاف کا معلوم کرنا جو آفتاب کے فاصلہ سے پیدا (باقی ص۵۴ پر)

لمبے قد کے بادشاہوں کے تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔ جنہوں نے تیس تیس ہزار سال تک حکمرانی اور فرمانروائی کی[1]۔ وہ جغرافیہ جو شیر سے، راب اور مکھن کے سمندروں کے بیانات پر مشتمل ہے[2]۔

ہم اس راہ پر بغیر کسی سابقہ تجربے کے نہیں بڑھ رہے۔ تاریخ میں اس سے ملتے جلتے کئی ایک واقعات موجود ہیں اور ان سب سے ایک ہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ دُور نہ جایئے دورِ جدید میں اُس عظیم تحریک کی دو قابل یادگار مثالیں دیکھیے جس نے پورے سماج کے ذہن کو متحرک کیا۔ تعصبات کے بندھن توڑے، علم پھیلایا، انسانی ذوق کو پاکیزگی بخشی اور وُہ ممالک جن میں جہالت اور درندگی کا دور دورہ تھا اُن میں مختلف علوم و فنون کی آبیاری کی۔

پہلی مثال جس کی طرف میں اس وقت اشارہ کر رہا ہوں وہ احیار العلوم کی وہ مہتم بالشان تحریک ہے جس نے یورپین اقوام کے اندر پندرھویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں جنم لیا[3]۔ اہلِ روما اور اہلِ یونان کی

بقیہ حاشیہ ص۵۳) ہوتا ہے اور جسے اختلافِ حرکتِ قمر کہتے ہیں اور جس کا انکشاف ۱۶۰۱ء میں ٹیکو براہے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ (تمدنِ عرب)

[1] مسلمانوں کا تو کوئی مورخ ایسا نہیں جس نے اس قسم کی تاریخ مرتب کی ہو۔ ابنِ خلدون کا مقدمہ آج بھی دنیا میں فلسفۂ تاریخ پر آخری کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میکالے کو عربی زبان کے تاریخ و جغرافیہ کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ اس لئے صرف طلسم ہوشربا سُن کر یہ نوٹ مرتب کر ڈالا۔

ادبی تخلیقات میں اُس وقت ہر ایسی چیز موجود تھی جسے قابلِ مطالعہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ اگر ہمارے آباد اجداد اُس طرح کا طرزِ عمل اختیار کرتے جو کہ اب تک مجلس تعلیماتِ عامہ نے اختیار کر رکھا ہے اگر وہ سسرو اور ٹیسی ٹس کی زبان کو نظر انداز کرتے، اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف اپنی بولی پر ہی مرکوز رکھتے، اگر وہ اینگلو سیکسونی قِصّے کہانیوں، اور نارمن فرنچ رومانی داستانوں کے علاوہ نہ تو کچھ پڑھاتے اور نہ ہی کچھ شائع کرتے. تو کیا انگلستان اس بلند مقام پر فائز ہو سکتا تھا جس پر وہ اس وقت فائز ہے؟ مور اور اسکنام کے معاصرین کی نگاہ میں جو حیثیت یُونانی اور لاطینی زبانوں کی تھی وہی حیثیت اہلِ ہند کے نزدیک انگریزی کی ہے۔ انگریزی ادب عہدِ عتیق کے ادب سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہے اور مجھے اس امر میں شک ہے کہ سنسکرتی ادب قدر و قیمت کے لحاظ سے ہمارے سیکسینی اور نارمن آباد اجداد کی ادبی تخلیقات کے ہم پلہ بھی ہو سکتا ہے۔ علم کے بعض شعبوں مثلاً تاریخ میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صورتِ حال اس سے بدرجہا بہتر ہے[لہ]۔

سے (حاشیہ صفحہ سابق) یہ تحریک بھی عربوں ہی کی علمی کاوشوں کا صدقہ تھی۔

"اسلامی فلسفہ نے نہ صرف یُونانی افکار کی تہذیب کی بلکہ انہیں آگے بھی بڑھایا۔ اس نے عیسائی مفکرین کو فلسفہ اور مذہب کے درمیان تطبیق دینا سکھایا لیکن اسلامی فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دورِ متوسط کی تاریکی کو علم کی روشنی سے بدل دیا۔" (اسلام اور عرب۔ روم لانڈو)

لہ میکالے نے یہاں پھر ایک مغالطہ دیا ہے۔ انگریزوں نے جو کچھ بھی ترقی کی۔ وہ یونانی، لاطینی اور عربی زبانوں سے مدد لے کر ضرور کی، مگر انہوں نے انکی مدد سے خود (باقی ص۵۶ پر)

ایک دوسری مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ قوم جو ایک سو بیس سال پیشتر وحشت وبہیمت کی اُس منزل میں تھی جس میں کہ صلیبی جنگوں سے قبل ہمارے آباء اجداد تھے، اُس نے آہستہ آہستہ جہالت کے قعرِ عمیق سے نکل کر مہذب اقوام کے درمیان اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس سے میری مراد روسی قوم ہے۔ اب روس میں ایک بہت بڑا تعلیم یافتہ طبقہ معرضِ وجود میں آچکا ہے جو ریاست کے اہم ترین امور کو سر انجام دینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ طبقہ کسی لحاظ سے بھی اُن اصحاب کمال سے فروتر نہیں ہے جن سے لندن و پیرس کے نہایت اُونچے طبقوں کی تزئین ہوتی ہے۔ یہ عظیم سلطنت جس کی حالت ہمارے جداجد کے عہد میں غالباً پنجاب (یعنی رنجیت سنگھ کے پنجاب) سے بھی بدتر تھی وہ آئندہ دو پشتوں تک ترقی کے میدان میں فرانس اور انگلستان کے ہمرکاب ہو گئی۔ آخر یہ انقلاب کس طرح رونما ہوا۔ نہ تو قومی تعصبات وامتیازات کو ہوا دینے سے، نہ روسی نوجوانوں کے دل ودماغ کو اُن بوڑھی عورتوں کے قصّے کہانیاں سنا کر پراگندہ کرنے سے۔ جن پر اُن کے غیر متمدن اور ناتراشیدہ آباء اجداد ایمان رکھتے تھے، نہ اُن کے ذہنوں کو سینٹ نکولس کی خرافات کی آماجگاہ بنا کر، نہ انہیں اس "اہم مسئلہ" کے مطالعہ پر متوجہ کر کے کہ یہ دنیا تیرہ ستمبر کو تخلیق ہوئی تھی، نہ اُن لوگوں کو "ملکی علماء" کے اعزاز سے مشرف فرما کر جو ان عجائب وغرائب کا علمی احاطہ کر چکے ہوں۔ یہ تبدیلی تو اُن غیر ملکی زبانوں کے سکھانے سے معرضِ وجود

(بقیہ ص۵۵) اپنی زبان کو مالا مال کیا اور اسے علمی زبان بنا لیا۔ یہ غلطی انہوں نے ایکدن بھی نہیں کی کہ انگریزی کو چھوڑ کر کسی بیرونی زبان کو اپنی تعلیمی زبان بنا لیتے۔ لیکن میکالے اس مثال کو بنیاد بنا کر اس بات پر استدلال کر رہا ہے کہ ہندوستان میں دیسی زبانوں کو چھوڑ کر انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

میں آئی جن میں معلومات کا سب سے زیادہ بیش قیمت خزانہ موجود ہے اور اس طرح علم کے سارے ذخائر تک اُن کی دسترس ہو گئی۔ مغربی یورپ کی زبانوں نے اہلِ روس کو مہذب اور متمدن بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان زبانوں نے تاتاریوں کو جو کچھ دیا ہے اُس سے وہ ہندوؤں کو بھی مالا مال کر سکتی ہیں[1]۔

آیئے اب ہم اُن دلائل کا جائزہ لیں جو اس طرزِ عمل کے خلاف، جس کی تائید اصول اور تجربہ دونوں کرتے ہیں، بالعموم پیش کئے جاتے ہیں۔ بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں اہلِ ملک کا تعاون حاصل کرنا چاہیئے اور یہ چیز ہم عربی اور سنسکرت پڑھائے بغیر نہیں کر سکتے۔

میں اس بات کو قطعاً تسلیم نہیں کر سکتا کہ جب ذہنی لحاظ سے ایک ترقی یافتہ قوم پر کسی نسبتاً جاہل قوم کے نظامِ تعلیم کی نگرانی کا فرض عائد ہو، تو اس صورتِ حال میں متعلّمین سے یہ کہا جائے کہ تم وہ نصاب طے کرو جسے اساتذۂ کرام تمہیں پڑھائیں۔ اس موضوع پر تو کچھ کہنا محض تحصیلِ حاصل ہے کیونکہ یہ امر ناقابلِ تردید شواہد سے ثابت ہے کہ ہمیں اس وقت اہلِ ملک کا تعاون حاصل نہیں ہے مگر یہ بہت غلط ہو گا کہ ہم اہلِ ملک کی علمی و عقلی صحت کو نظر انداز کر کے ان کے

---

[1] یہ پھر وہی مغالطہ ہے۔ کیا روسیوں نے اپنی زبان چھوڑ کر مغربی زبان کو اپنے ہاں ذریعہ تعلیم بنا لیا تھا اور یہی ان کی ترقی کا ذریعہ بنا؟ یا دراصل انہوں نے ساری ترقی اس بنا پر کی کہ دوسری زبانوں کے علوم لے کر اپنی زبان کو مالا مال کیا۔ دراصل میکالے صاحب نے وہ نسخہ ہمارے لیے تجویز کیا تھا جو کسی قوم کی ترقی کا نہیں بلکہ اسے ایسا غلام بنانے کا نسخہ تھا کہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہی بنی رہے۔

ذوق کا پاس کرنے لگیں[1]۔ اور یہاں تو ہم ان کے ذوق کا پاس بھی نہیں کر رہے
ہیں۔ ہم انہیں اُس تعلیم سے محروم کر رہے ہیں جسے حاصل کرنے کے وہ شدید
طور پر آرزومند ہیں اور اُن پر وُہ مضحکہ خیز نظامِ تعلیم مسلّط کر رہے ہیں۔ جس سے
انہیں گھن آتی ہے۔

یہ بات اِس امر واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت پڑھنے
والے طلبا کو تو معاوضہ دینا پڑتا ہے مگر ان کے برعکس وہ لوگ جو انگریزی تعلیم
حاصل کرتے ہیں وہ فیس دینے پر بالکل آمادہ ہیں۔ اگر دنیا کی ساری فصاحت لسانی
بھی محبت اور احترام کے اُن جذبات کے اظہار میں صرف کر دی جائے جو اس ملک
کے لوگ اپنی مادری زبانوں کے لئے اپنے سینوں میں رکھتے ہیں تب بھی کوئی غیر
جانبدار انسان اس بدیہی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ہمیں اپنی اس عظیم قلمرو کے
اندر ایک طالب علم بھی ایسا نہیں ملا جسے وظیفہ دیئے بغیر ان زبانوں کے پڑھنے
پر آمادہ کیا جا سکتا ہو[2]۔

---

[1] علمی و عقلی صحت سے مراد غالباً محض کلرک بن سکنا ہے۔

[2] یہ عجیب بات ہے کہ پہلے تو ان لوگوں نے مشرقی علوم اور زبانیں پڑھنے والوں
کے لئے رزق کے تمام دروازے بند کر کے صرف ان طالب علموں کے لئے روٹی اور
عزت کے مواقع مخصوص کر دیئے جو انگریزی پڑھیں۔ پھر جب حال یہ ہو گیا کہ لوگ پیسے
دے کر انگریزی پڑھنے لگے اور وظیفہ لئے بغیر مشرقی علوم پڑھنے سے جی چرانے لگے تو اسے
اس امر کی دلیل بنا لیا گیا کہ ہندوستان کے باشندوں کو تو اپنی زبانوں سے گھن آتی ہے
اور وُہ اپنے لئے انگریزی ہی پسند کرتے ہیں۔ تاہم واقعات تمام تر لارڈ میکالے کا م

میرے سامنے اس وقت کلکتہ مدرسہ کے ایک مہینے یعنی دسمبر ۱۸۳۳ء کے
حسابات ہیں۔ عربی پڑھنے والے طلبا کی تعداد ۷۷ ہے اور ان سب کو مجموعی طور پر
ہر مہینے پانچ سو روپے سے زائد وظائف دیئے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے
سامنے حساب کی یہ مد بھی موجود ہے کہ انگریزی پڑھنے والے طلبا سے گذشتہ
ماہ مئی، جون اور جولائی میں وصول شدہ رقم ۱۰۳ روپیہ مذکورہ بالا اخراجات میں
سے منہا کیے گئے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ اس صورتِ حال پر میرا استعجاب یہاں کے مقامی حالات
سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ذاتی اخراجات سے تعلیم حاصل کرنے
کا رواج قریب قریب ناپید ہے۔ لیکن یہ چیز تو میری رائے کو اور زیادہ تقویت بخشتی ہے
یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کہیں بھی لوگوں کو ایسے کاموں کے لیئے کچھ دینا نہیں پڑتا۔
جنہیں وہ خود اپنے لئے خوش آیند یا نفع آور خیال کرتے ہوں۔ ہندوستان بھی اس
اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ ہندوستانی جب بھوک محسوس ہونے پر چاول کھاتے ہیں تو

بقیہ شہ ساتھ نہیں دیتے۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ ہے
جسے گیرٹ صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں صاف الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے
کہ کالج کے آغاز سے تیس برس تک گورنمنٹ کالج کے جتنے پرنسپل آئے وہ سب یہی
رونا روتے رہے کہ وظائف کے بغیر لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ نہیں
چنانچہ نہ صرف طلبا کو وظائف دیئے گئے بلکہ تعلیم سے فارغ ہو چکنے کے بعد
ان کے لیئے ملازمتوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ یہ اُس دور کے حالات ہیں۔ جبکہ
سر سیّد کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

انہیں کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا، انہیں موسم سرما میں گرم کپڑے پہننے کے لئے بھی
کوئی وظیفہ دے کر آمادہ نہیں کیا جاتا۔ جو صورت حال اس وقت ہمیں درپیش ہے
اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ دیکھیے کہ وہ بچّے جو دیہی مدارس میں ابتدائی حسا
اور کتابیں پڑھتے ہیں انہیں استاد کوئی مادی صلہ نہیں دیتا بلکہ مدرس کو اس کی محنت
کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ پھر آخر ان لوگوں کو کیوں محنتانہ دیا جائے جو سنسکرت اور
عربی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے اور اسے ہر شخص بڑی شدّت کے
ساتھ محسوس بھی کرتا ہے کہ سنسکرت اور عربی دو ایسی زبانیں ہیں جن کے اکتساب سے
اُس مشقت کی تلافی نہیں ہوتی جو انہیں سیکھنے کے لئے اٹھانی پڑتی ہے[1]۔ یہاں اصل اور
فیصلہ کن چیز صرف منڈی[2] ہے

---

[1] انگریزی کی یہاں تشریف آوری کے بعد ملک کے اندر اس قسم کی فضا تیار کرنے
کی کوشش کی گئی جس میں یہ مشرقی علوم خود بخود دم توڑ دیں۔ اس بدلے ہوئے ماحول
میں اگر یہ علوم ختم نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔ اُسے تو محض ایک معجزہ سمجھیئے کہ ان علوم کے
لئے اس قدر ناسازگار حالات پیدا کر دینے کے باوجود یہ آج تک زندہ چلے آرہے ہیں۔

[2] یہ ہے کانٹے کی بات۔ پہلے ایک قوم کو بھوکا مار دیہاں تک کہ اس کے لئے
سب کچھ منڈی میں فروخت ہونے والا مال بن جائے۔ پھر اس کے اپنے علوم کے لئے
مارکیٹ میں مکمل کساد بازاری پیدا کر دو اور فاتح قوم کے علوم حاصل کرنے والوں کو اچھے
داموں خریدنا شروع کر دو۔ اس کے بعد جب ان علوم کا بھاؤ آپ سے آپ چڑھ جائے
تو اسے اس بات کی دلیل بناؤ کہ دیسی زبانیں اور ان کے علوم تو ہیں ہی ناکارہ ورنہ
بازار میں ان کی قیمت اس قدر کیوں گر جاتی ؟

اگر اس ضمن میں مزید شواہد درکار ہوں تو اُن کی بھی کوئی کمی نہیں۔ سنسکرت کالج کے قدیم طلبا نے گذشتہ سال کمیٹی کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ کالج میں دس بارہ سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور انھوں نے ہندو ادب اور علوم سے اچھی خاصی واقفیت پیدا کرلی ہے اور اسی سلسلہ میں انہیں اسناد فضیلت بھی مل چکی ہیں۔ لیکن اس کا ثمرہ انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ ان اسناد کے باوجود ابنائے وطن اُن سے بالکل بے توجہی برتتے ہیں۔ اپنے اہلِ ملک سے انہیں کسی مدد یا حوصلہ افزائی کی اُمید نظر نہیں آتی۔ اب اگر معزز کمیٹی ان کی دستگیری نہ کرے تو وہ اصلاحِ احوال کے کوئی امکانات نہیں دیکھتے۔ لہٰذا وہ ملتجی ہیں کہ حکومت کے تحت انہیں ایسے مناصب دینے کی حضور گورنر جنرل کی خدمت میں سفارش کی جائے جو اگرچہ بہت اونچے نہ سہی مگر انہیں زندہ رہنے کے قابل تو بنا دیں۔ انہیں بہتر رہائش اور ترقی کے لئے ذرائع کار درکار ہیں۔ جنہیں وہ اس حکومت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کرسکتے جو بچپن سے ہی ان کی تعلیم کی کفیل رہی ہے۔ ان طلبا نے اپنی عرضداشت کو اس رقت انگیز التجا پر ختم کیا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ حکومت جس نے دوران تعلیم میں اُن کے ساتھ انتہائی فیاضی کا سلوک کیا ہے اُس کی کبھی یہ نیت نہ تھی کہ تعلیم کے بعد انہیں بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا۔

معاوضوں کے لئے حکومت کے سامنے جو عرضداشتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اکثر میری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ ساری عرضداشتیں حتٰے کہ سب سے زیادہ نامعقول درخواستیں بھی اس بنیاد پر مبنی ہیں کہ ان حضرات کا کوئی بہت زیادہ نقصان ہوا

ہے یا ان کے ساتھ کوئی بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ پہلے دادخواہ ہیں جنہوں نے مفت تعلیم حاصل کرنے کا معاوضہ طلب کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دس بارہ سال ملکی خزانے سے امداد ملتی رہی اور پھر انہیں ادب اور علوم سے خوب بھر کر دنیا میں بھیج دیا گیا۔ اب یہ اپنی اس تعلیم کو اپنے حق میں ایک ایسی زیادتی سے تعبیر کرتے ہیں جس کی حکومت کو تلافی کرنی چاہیئے۔ ایک ایسی چوٹ جس کی تکلیف کے مقابلے میں وہ مالی امداد انہیں کم نظر آتی ہے جو انہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے دی گئی تھی۔ میں ان لوگوں کو یقیناً برحق سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ ایک ایسی چیز کو سیکھنے میں کھپایا ہے جس کے ذریعہ نہ تو وہ روٹی کما سکتے ہیں نہ انہیں معاشرہ میں عزت و احترام ہی حاصل ہوتا ہے۔ ہم اس رقم کو جسے ان لوگوں کو نکما اور بیکار بنانے پر صرف کیا گیا ہے کسی بہتر مصرف کے لئے بچا سکتے تھے۔ ریاست بہت کم خرچ کر کے بھی انہیں بڑی آسانی کے ساتھ اہلِ ملک کے لئے ایک بوجھ اور تذلیل و تحقیر کا ہدف بنانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ مگر ہم نے اس پالیسی کو اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم نے حق اور باطل کی کشمکش میں غیر متعلق تماشائی بن کر رہنا بھی گوارا نہ کیا۔ بلکہ ہم اس بات پر بھی قانع نہ ہوئے کہ اہل ملک کو اپنے آبائی تعصبات کا اثر قبول کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتے۔ ہم نے خود آگے بڑھ کر اُن قدرتی موانع کے ساتھ جو مشرق میں حقیقی علمی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اپنی طرف سے بہت سی مشکلات کا اضافہ کر لیا۔ وہ مراعات و وظائف جنہیں شاید ہم حق و صداقت[1] کی نشر و

[1] سوال یہ ہے کہ اس قسم کے حوصلہ شکن حالات آخر پیدا کس نے کیے۔ یہ تو صرف سرکار انگریزی کی کرم فرمائی تھی کہ اس ملک کے لوگ اپنے علوم پڑھ کر اس درجہ خوار ہونے لگے

اشاعت پر بھی خرچ کرنا مناسب نہ سمجھیں۔ انہیں غلط ذوق اور باطل فلسفہ کے پھیلانے پر ہم بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔

ہمارے اس طرزِ عمل سے وُہ برائی پروان چڑھ رہی ہے جس سے ہمیں خدشہ لاحق ہے ہم اُس مخالفت کو جنم دے رہے ہیں جو فی الحال ناپید ہے۔ عربی اور سنسکرت کالجوں پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ نہ صرف صداقت کی حق تلفی ہے بلکہ سرکاری خزانے سے غلط کاروں کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اس رقم سے ایسی پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی ہیں جن میں نہ صرف مجبور و بے بس بیروزگار پناہ لیتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایسے متعصب اور تنگ نظر لوگوں کو بھی پرورش کیا جا رہا ہے۔ جو اپنے تعصبات اور مفادات کی بنا پر ہر نئی تعلیمی سکیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں[1]۔ اگر ہندوستان میں اس تبدیلی کے خلاف جس کی میں اس وقت وکالت کر رہا ہوں، کچھ بھی جذبہ موجود ہے تو یہ ہمارے اپنے نظام کا نتیجہ ہے اس مخالفت کے قائدین وہی لوگ ہوں گے جو ہمارے وظائف پر پلے ہیں اور ہمارے اپنے کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم اپنی موجودہ روش پر جتنے لمبے عرصے تک گامزن رہیں گے۔ اتنی ہی مخالفت تیز تر ہوتی چلی جائے گی اور اس تحریک کو ہر سال ہم اپنی جیب سے خرچ کر کے ایسے تازہ دم مردان کار مہیا کریں گے جو اس کی تقویت کا باعث ہوں گے۔ اگر اہل ملک کو صرف اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے تو کسی قسم کی مشکلات کا اندیشہ نہیں۔ ساری بک بک اسی مشرقی مفاد کی طرف سے ہوگی جسے ہم نے بالکل مصنوعی طریقوں سے پیدا کر کے قوت و توانائی

---

[1] یہ ہے اصل خار جو کھٹک رہا ہے۔

بخشی ہے۔

ایک اور امر بھی اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ اگر رائے عامہ سے تعرض نہ کیا جائے تو وُہ فی الواقع اُس انداز سے مختلف ہو گی جس انداز سے کر قدیم نظامِ تعلیم کے حامی اُسے پیش کرتے ہیں۔ کمیٹی نے عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک لاکھ کی رقم وقف کی مگر ان کتابوں کی اب کوئی نکاسی نہیں۔ کبھی کبھار کوئی ایک آدھ کتاب فروخت ہو جاتی ہے۔ تیئس ہزار نسخے جن میں بیشتر کی ابھی تک جزو بندی بھی نہیں ہوئی۔ مختلف لائبریریوں یا کمیٹی کے گودام میں بکھرے پڑے ہیں۔ کمیٹی نے مشرقی ادب کے اس وسیع ذخیرے کے ایک حصّہ سے خلاصی پانے کے لئے کتابوں کی مفت تقسیم شروع کی مگر وہ جس رفتار سے شائع ہو رہی ہیں اُس رفتار سے تقسیم نہیں کی جا سکتیں۔ سال بھر میں بیس ہزار روپے کی رقم ان ردّی کاغذوں میں اضافہ پر صرف کی جا رہی ہے۔ جن کا سٹاک ہمارے پاس کافی مقدار میں پہلے سے موجود ہے۔ گزشتہ تین سالوں میں اس طرح تقریباً ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔ لیکن اسی عرصہ میں عربی اور سنسکرت کتابوں کی فروخت سے جو آمدنی ہوئی ہے وہ بصد مشکل ایک ہزار روپیہ تک پہنچتی ہے[1]۔ اس کے برعکس اسی اثنا میں سکول بک سوسائٹی نے انگریزی کتابوں

[1] ان کتب کی نشر و اشاعت کا معاملہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہے۔ سنسکرت کی کتابوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن فارسی اور عربی کی کتب کے متعلق یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا انتخاب انتہائی ناقص تھا۔ اس وجہ سے ان کا صحیح طور پر نکاس نہ ہو سکا۔

کی سات یا آٹھ ہزار جلدیں سالانہ فروخت کی ہیں۔ فروخت کے ان حاصلات سے نہ صرف اشاعت کے اخراجات پُورے ہو رہے ہیں بلکہ سرمایہ پر بیس فیصد نفع بھی مل رہا ہے۔

اس بات پر بہت اصرار کیا گیا ہے کہ ہندو قانون تو سنسکرت کی کتابوں اور محمڈن لاعربی کتابوں ہی سے اخذ کرنا ہوگا۔ لیکن یہ معاملہ مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ ہمیں پارلیمنٹ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے لئے قوانین مرتب کریں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں لاء کمیشن کی امداد بھی بہم پہنچائی گئی ہے۔ جس وقت نیا ضابطہ قانون نافذ ہوگا، اُسی وقت منصفوں اور صدر امینوں کے لئے شاستر اور ہدایہ بالکل بیکار ہو جائیں گی۔ مجھے اُمید واثق ہے کہ وُہ طلبار جنھوں نے اب عربی مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخلہ لیا ہے، اُن کے تعلیم سے فارغ ہونے سے پیشتر، یہ عظیم کام پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہوگا۔ ہمارا یہ فعل بدیہی طور پر احمقانہ ہوگا کہ ہم نئی نسل کو اُن حالات کے پیش نظر تعلیم دیں جنہیں اُن کے جوان ہونے سے پہلے ہم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں[1]۔

---

[1] لارڈ میکالے کا طرز استدلال ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ ملک کے سارے حالات، خواہ اُن کا تعلق سیاست سے ہو یا قانون یا معیشت یا معاشرت سے، بدل دینے کا تہیہ کر چکے ہیں اور دوسری طرف وہ اہلِ ملک کے متعلق یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو پُرانے نظامِ تعلیم سے کوئی لگاؤ اور دلچسپی نہیں۔ جن لوگوں کو اپنی اقدارِ حیات سے صحیح معنوں میں وابستگی رہی وہ تو آخر دم تک اسی نظامِ تعلیم کے حامی رہے جو انہیں اپنے اسلاف سے ملا تھا۔ باقی رہے وہ حضرات جو ہر چڑھتے سورج کے پجاری[باقی]،

عربی اور سنسکرت کے حق میں ایک اور دلیل جو اس سے بھی کہیں زیادہ کمزور اور بودی ہے، یہ دی جاتی ہے کہ ان زبانوں میں چونکہ کروڑوں انسانوں کی مقدس کتابیں موجود ہیں اس بنار پر یہ خصوصی امداد کی مستحق ہیں۔ سرکار انگریزی کا بلاشبہ یہ فرض ہے کہ وہ ہندوستان کے مذہبی معاملات میں نہ صرف رواداری ہو بلکہ غیر جانبدار بھی ہو۔ مگر کسی ایسے ادب کی (جو مسلّمہ طور پر بہت کم قدر و قیمت کا حامل ہے) محض اس وجہ سے حوصلہ افزائی کرتے چلے جانا کہ اس میں بعض اہم موضوعات پر انتہائی غلط باتیں موجود ہیں۔ میرے نزدیک ایک ایسی روش ہے جس کی تائید نہ تو عقل کرتی ہے نہ اخلاق اور نہ وہ غیر جانبداری جس کا قائم رکھنا ہم سب کا ایک مقدس فرض ہے۔ ایک ایسی زبان جس کے بارے میں ہر شخص (یعنی ہر انگریز) تسلیم کرتا ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کی مفید معلومات سے خالی ہے کیا اُس کے پڑھانے کا اس لئے التزام کیا جائے کیونکہ یہ ہیبت ناک ادہام کو جنم دیتی ہے؟ کیا ہم جھوٹی تاریخ، غلط علم ہیئت اور غلط تاریخ محض اس لئے پڑھائیں کہ ان سے ایک باطل مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ ہم اس بات سے بہت زیادہ احتراز کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے کہ اُن مسیحی مشنریوں کی سرکاری طور پر پشت پناہی کی جائے جو اہل ملک کو عیسائی بنانے

(بقیہ حاشیہ ص۶۵) سورج کی پرستش کرنے والے تھے اور جن کی پیشانی ابھرتے ہوئے اقتدار کے سامنے فوراً جھک جاتی تھی۔ جن کی نگاہ پیٹ اور جیب سے آگے نہیں گزرتی تھی وہ اگر بدلتے ہوئے حالات کے سامنے سر تسلیم خم کر کے نئے نظامِ تعلیم کو خوش آمدید کہنے لگے تو اس میں تعجب کی کونسی بات تھی۔

میں مصروف ہیں۔ جب علیسائیت کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم حکومت کے خزانے سے رشوت دے کر لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اپنی نئی نسل کو اس قسم کی تعلیم دلوائیں جس کے ذریعہ انسان یہ جان سکے کہ گدھے کو چھونے کے بعد آدمی کس طرح پاک ہو سکتا ہے۔ یا وید کے کن اشلوکوں سے بکرا مار دینے کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔

مشرقی علوم کے حامی اس بات کو ایک تسلیم شدہ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس ملک کا کوئی باشندہ انگریزی زبان کی بالکل ابتدائی واقفیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وُہ اسے ثابت تو نہیں کر پاتے مگر اس پر ہمیشہ اصرار ضرور کرتے ہیں۔ یہ حضرات محض تحقیر کے طور پر انگریزی تعلیم کو محض ہجے سکھانے کی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اصل مسئلہ نہایت اونچے درجے کے ہندی اور عربی علم و ادب اور انگریزی مبادیات کی سطحی معلومات کے مابین انتخاب ہے۔ یہ نہ صرف ایک مفروضہ ہے بلکہ ایک ایسا مفروضہ جس کی عقل اور تجربہ دونوں تائید نہیں کرتے۔ ہم اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ ساری قوموں کے لوگ ہماری زبان سے اس حد تک واقف ہیں جس سے وُہ

ـلـه گزشتہ دو سو سال کے واقعات نے تو ان حضرات کے اس دعوے کو بالکل صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آخر ہم نے اتنی محنت و مشقّت کے بعد انگریزی میں کتنے شیکسپیئر کتنے ملٹن اور کتنے کارلائل اور رسکن پیدا کئے ہیں؟ دوسری طرف دیکھ لیجئے کہ غلامی اور انحطاط کے باوجود اسی مدت کے اندر ہمارے ہاں اپنی زبان کے کیسے کیسے نامور ادیب پیدا ہوئے۔

بآسانی اُن دقیق اور پیچیدہ مسائل کو سمجھ سکتے ہیں جن سے اس زبان کا دامن بھرپور ہے اور اس کے ذریعہ وہ اُن ادبی لطافتوں سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں کے اعلیٰ انشا پردازوں کی تحریروں میں موجود ہیں۔ اسی شہر (کلکتہ) میں بہت سے ایسے ہندوستانی موجود ہیں جو انگریزی زبان میں بڑی سلاست اور جامعیت کے ساتھ سیاسی اور علمی موضوعات پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ میں نے اسی مسئلہ پر جس کے متعلق میں اس وقت تحریر کر رہا ہوں بعض ہندوستانی شرفا کو اس کشادہ دلی اور فہم و فراست کے ساتھ بحث کرتے ہوئے دیکھا ہے جو مجلسِ تعلیماتِ عامہ کے ارکان کے لئے بھی عزت و افتخار کا باعث ہو سکتی ہے۔ برّاعظم یورپ کے ادبی حلقوں میں بھی ایسے غیرملکی شاید خال خال ہی ملیں جو اتنی رواں اور صحیح انگریزی بول سکیں جتنی کہ بعض ہندو بولنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اس امر سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ انگریزی ایک ہندو کے لئے اتنی مشکل نہیں جتنی کہ یونانی ایک انگریز کے لئے ہو سکتی ہے۔ جتنے عرصے میں ہمارے بدنصیب طلبا سنسکرت کالج سے فارغ ہوتے ہیں اس سے کہیں کم مدت میں ایک ذہین انگریز نوجوان یونانی مصنفین کی تحریروں کو پڑھنے، ان سے لطف اندوز ہونے اور انکا تتبع کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک انگریز نوجوان جتنا وقت ہیروڈوٹس اور سفوکلیز کو سمجھنے کے لئے لیتا ہے اس سے کم مدت میں ایک ہندو کو ہیوم اور ملٹن سمجھ لینا چاہیئے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ ہم پارلیمنٹ کے ۱۸۱۳ء کے قانون کے کسی طرح بھی پابند نہیں۔ ہم کسی ایسے

معاہدے کی جکڑ بندیوں میں بھی گرفتار نہیں جو ہم نے صراحتاً یا کنایتہً کیا ہو۔ ہم اپنے فنڈ کے استعمال میں بلکہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ ہمیں اس رقم کو اس تعلیم پر خرچ کرنا چاہیئے جو موزوں ہے اور اس نقطہ نظر سے انگریزی زبان سنسکرت اور عربی کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے۔ اس ملک کے رہنے والے عربی اور سنسکرت پڑھنے کے قطعاً خواہشمند نہیں بلکہ انگریزی سیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ دونوں زبانیں قانونی ضرورت کے تحت بھی اور مذہبی ضرورت کے پیش نظر بھی کسی خصوصی امداد کی مستحق نہیں ٹھہرائی جا سکتیں۔ اس ملک کے باشندوں میں ہم انگریزی کے بہت اچھے فاضل پیدا کر سکتے ہیں۔ اور اسی مقصد پر ہماری ساری کوششیں مرکوز ہونی چاہئیں میں ان حضرات سے جن کی میں نے مخالفت کی ہے ایک معاملے میں پوری طرح متفق ہوں۔ میرا ذاتی تاثر بھی اُن کے احساس کی طرح یہی ہے کہ ہم فی الحال اپنے محدود ذرائع کے ساتھ سب لوگوں کی تعلیم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سر انجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمران ہیں ــــــ ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطہ نظر سے انگریز[1]۔ پھر اس کام کی ذمّہ داری اس طبقے پر چھوڑ دیں کہ وہ اس ملک کی بولیوں کو سنوارے، مغربی علوم سے سائنسی اصطلاحات لے کر ان زبانوں کو مالا مال کرے اور آہستہ آہستہ انہیں اس قابل بنائے کہ ان کے ذریعے ملک کی عام آبادی کو تعلیم دی جا سکے۔

[1] اس ساری جدوجہد کی اصل غرض بس یہی ہے۔

اس وقت جو مفادات موجود ہیں مجھے ان کا پورا پورا احترام ہے۔ میں ان سارے افراد سے فیاضانہ سلوک اور برتاؤ کرنے کے لئے تیار ہوں جو جائز طور پر مالی امداد کے حقدار ہیں۔ لیکن میں اس غلط نظامِ تعلیم کو جس کی ابھی تک ہم آبیاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ بیخ و بُن سے اکھاڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں فی الفور عربی اور سنسکرت کتب کی طباعت روکنے اور مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج کو مقفل کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بنارس برہمنی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے اور دہلی عربی کا۔ اگر ہم صرف بنارس میں سنسکرت کالج اور دہلی میں عربی کالج قائم رکھیں تو میرے نزدیک مشرقی زبانوں کے حق میں یہی چیز کافی بلکہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہے اگر بنارس اور دہلی کے کالجوں کو قائم رکھنا ہو تو میں کم از کم اس بات کی سفارش ضرور کروں گا کہ جو طلبہ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں انہیں قطعاً کوئی وظیفہ نہ دیا جائے۔ بلکہ لوگ دو متقابل نظامہائے تعلیم کے درمیان انتخاب کرنے میں بالکل آزاد ہوں اور انہیں قطعی طور پر کسی ناجائز ترغیب سے ایسی تعلیم کے حصول پر آمادہ نہ کیا جائے جس کے لئے وُہ خود تیار نہیں ہیں۔ اس طرح وُہ فنڈ جو ہمارے ہاتھ آئیں گے اُن سے ہم کلکتہ کے ہندو کالج کو (جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی) نسبتاً زیادہ مالی امداد بہم پہنچا سکیں گے اور اس قابل ہوں گے کہ فورٹ ولیم اور آگرہ پریذیڈنسی کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے سکول قائم کریں جن میں انگریزی زبان اچھی طرح پڑھائی جا سکتی ہو۔

اگر ہزلارڈشپ باجلاس کونسل کا فیصلہ یہی ہو۔ اور جیسا کہ میں اُمید کرتا ہوں یہی ہوگا۔ تو میں پھر اپنے فرائض کو پورے جذبہ اور مستعدی سے ادا کرنے کے لئے

تیار ہوں۔ لیکن اگر بالفرض حکومت موجودہ نظام کو جوں کا توں قائم رکھنے کا ارادہ
رکھتی ہو تو پھر میری درخواست یہ ہے کہ مجھے اس کمیٹی کی صدارت سے سبکدوش
ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ وہاں میرا وجود کسی افادیت
کا حامل نہیں۔ پھر مجھے اس بات کا بھی شدید احساس ہے کہ اس صورتِ حال
میں ایک ایسے نظام کی حمایت کرنے کا ارتکاب کروں گا جسے میں ایمانداری سے
اپنی دانست میں محض ایک فریبِ نظر سمجھتا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ موجودہ
نظام سے حق و صداقت کی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اس سے دم توڑتی ہوئی غلط کاریوں
کی طبعی موت میں کچھ تعویق ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک ہم اس بات کے قطعاً
مستحق نہیں کہ ہمیں مجلس تعلیماتِ عامہ کے معزز امتیاز سے مشرف کیا جائے۔ ہم
تو ایک ایسی منڈلی ہیں جو ردیہ کاریاں کر رہی ہے، ایسی کتابیں شائع کر رہی ہے
جن کے چھپنے سے کاغذ کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی ان کے چھپنے سے
پہلے ہوتی ہے۔ لغو تاریخ، لغو الہٰیات، لغو طبیعیات، اور لغو دینیات کو بالکل
مصنوعی طریق سے فروغ دے رہی ہے، اہلِ علم کا ایک ایسا گروہ تیار کر رہی ہے جو
اس علم کو اپنے حق میں ایک مصیبت اور عار سمجھتا ہے، جو دورانِ تعلیم عوام کی
امداد پر بسر اوقات کرتا ہے اور جس کی تعلیم اتنی بیکار اور غیر مفید ہے کہ اسے
حاصل کر لینے کے بعد بھی یا تو وہ فاقہ مستی کا شکار رہتا ہے یا زندگی کے باقی
ایام لوگوں کی خیرات پر گذارتا ہے۔ ان احساسات و نظریات کے ساتھ طبعاً
اس مجلس کی ذمہ داری میں شریک ہونے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا جسکے انداز اور طرز عمل کو اگر
بدلا نہ گیا تو وہ میرے نزدیک نہ غیر مفید ہے بلکہ لازمی طور پر نقصان دہ اور مضرت رساں بھی ہے

تمت

معیاری کتابیں

روپے-پیسے

۱۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ مرتبہ محمد ایوب قادری ایم، اے (قیمت) ۷-۵۵

۲۔ وصایا اربعہ 〃 〃 〃 ۳-۷۵

۳۔ تواریخ عجیب (المعروف بہ کالا پانی) 〃 〃 〃 ۴-۵۰

۴۔ تذکرہ علمائے ہند 〃 〃 〃 ۱۵-۰۰

۵۔ وقائع عبدالقادر خانی 〃 〃 〃 ۱۶-۵۵

۶۔ خط و خطاطی 〃 〃 〃 ۱-۵۰

۷۔ تاریخ فرخ آباد 〃 〃 〃 ۱۴-۵۵

۸۔ جنگ آزادی کا ایک مجاہد 〃 〃 〃 ۰۰-۷۵

۹۔ فضیلت صحابہؓ از شاہ عبدالعزیز دہلویؒ مع مقدمہ محمد ایوب قادری ایم اے 〃 ۶-۵۵

۱۰۔ خان بہادر خان شہیدؒ از مصطفیٰ علی (بی، کام) 〃 〃 〃 ۱-۵۰

۱۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات۔ از مولوی اعجاز الحق قدوسی 〃 ۱۰-۵۰

۱۲۔ تذکرہ صوفیائے سندھ 〃 〃 〃 ۴-۵۰

۱۳۔ تذکرہ صوفیائے پنجاب 〃 〃 〃 ۱۵-۵۰

۱۴۔ سوانح خواجہ معین الدین چشتیؒ از [illegible] احمد مسعود 〃 ۲-۵۰

۱۵۔ جمال [illegible] 〃 〃 〃 ۱-۲۵

۱۶۔ اسلام مشرق میں 〃 〃 〃 ۲-۵۰

۱۷۔ روضات۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مترجمہ مولانا ثناء اللہ ندوی 〃 ۲-۵۰